پاکستان میں نظامِ خلافت : کیا، کیوں اور کیسے؟

کے موضوع پر امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کی چار تحریریں اور ایک تقریر یکجا کتابی صورت میں شائع کر دی گئی ہیں!

تحریریں:

(1) ۱۹۹۱ء میں اجرائے تحریک کے موقع پر پریس کانفرنس میں بیان!

(2) عہد حاضر میں اسلامی ریاست یا نظام خلافت کا دستوری خاکہ!

(3) اسلامی ریاست یا نظام خلافت میں سیاسی جماعتوں کا کردار!

(4) پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار!

تقریر:

پاکستان میں نظام خلافت، امکانات، خدوخال اور اس کے قیام کا طریق کار

☆ کتابی سائز ☆ صفحات 96 ☆ سفید کاغذ ☆ دیدہ زیب ٹائٹل

قیمت : 30 روپے

24 APR 2001

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماھنامہ لاھور

حکمتِ قرآن

بیاد گار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی

نائب مدیر: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

معاون: حافظ خالد محمود خضر ایم ایس سی

جلد ۲۰ | محرم الحرام ۱۴۲۲ھ — اپریل ۲۰۰۱ء | شمارہ ۴

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶-کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شادی ہال۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۸۰ روپے فی شمارہ -/۸ روپے

اس شمارے کی قیمت -/۱۲ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے ۱۹۶۷ء میں ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا جو کتابچے کی صورت میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اب تک کثیر تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مقالہ میں محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک بھرپور جائزہ پیش کیا تھا کہ اس وقت ہم بحیثیت مسلمان کس مقام پر ہیں۔ نیز یہ بھی واضح کیا تھا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور امت مسلمہ کی تعمیرِ نو کے لئے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے' فی الوقت کیا ہو رہا ہے اور کیا کرنا باقی ہے۔ اپنے تجزیئے کی بنیاد پر محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک اساسی لائحہ عمل بھی پیش کیا تھا اور اولین اقدام کے طور پر ایک ''قرآن اکیڈمی'' کے قیام کی تجویز بھی پیش کی تھی۔

یہ لائحہ عمل پیش کرنے کے فوراً بعد ہی محترم ڈاکٹر صاحب نے باذن اللہ عملی جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نہج پر باقاعدہ اجتماعی جدوجہد اور خصوصاً ''قرآن اکیڈمی'' کے مجوزہ خاکے کو عملی صورت دینے کے لئے' پانچ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد' ۱۹۷۲ء میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' کا قیام عمل میں آ گیا۔ قرآن اکیڈمی کے قیام کے بعد قرآن حکیم کے علم و حکمت کی تشہیر و اشاعت کے لئے یہاں اولاً دو سالہ اور پھر ایک سالہ رجوع الی القرآن کورسز کا سلسلہ شروع کیا گیا تو ان کورسز میں پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بیرون پاکستان خصوصاً امریکہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ' فہیم نوجوان شریک ہوئے۔ ان میں بعض نوجوانوں نے فکرِ قرآنی کے اس شجرۂ طیبہ کا بیج امریکہ کی سرزمین میں ڈالا تو وہاں بحمد اللہ ایک ننھا سا پودا اجز پکڑ گیا' جوان شاء اللہ ایک تناور درخت بنے گا۔ امریکہ میں قرآن حکیم کے علم و حکمت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنے والے ان نوجوانوں میں سب سے ممتاز برادرم باسط بلال کوشل ہیں۔ آج سے پانچ سال قبل باسط بلال نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ''سالانہ محاضراتِ قرآنی'' کے موقع پر متواتر تین دن لیکچر دیئے تھے' جنہیں علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا تھا۔ ان لیکچرز پر جناب مجیب الرحمٰن شامی نے ''ایک بلالی اذان'' کے عنوان سے کالم بھی لکھا تھا۔

گزشتہ ماہ (۱۱ تا ۱۳ مارچ) ''محاضراتِ قرآنی'' کے مقرر پھر برادرم باسط بلال کوشل تھے جنہوں نے متواتر تین دن لیکچرز دیئے۔ ان لیکچرز کی رپورٹ زیرِ نظر شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔

قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ حکمت قرآن کا زیرِ نظر شمارہ دو اشاعتوں کا قائم مقام ہے۔ گویا یہ مارچ اپریل کا مشترک شمارہ ہے۔

درس ۱۸

نبی اکرم ﷺ کا بنیادی طریق کار
یا
انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ کی روشنی میں

(۳)

توراۃ کے ساتھ یہود کا طرزِ عمل —— ایک عبرت ناک مثال

فرمایا :

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

کہ تم سے پہلے بھی ایک امت حامل کتاب بنائی گئی تھی' تورات جیسی نعمت اسے عطا ہوئی تھی۔ حامل کا لفظ "حمل یحمل" سے اسم فاعل ہے۔ اس کا مفہوم ہے "بوجھ اٹھانے والا"۔ اسی طرح "حمّال" کہتے ہیں بوجھ اٹھا کر لے جانے والے کو۔ عربی زبان میں یہ لفظ عام طور پر مزدور کے لئے مستعمل ہے' یعنی وہ شخص جس کا کام ہی یہ ہے کہ بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے۔ گویا حامل کتاب الٰہی اس قوم کو کہا جائے گا جس کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کو دوسروں تک پہنچائے' اسے پھیلائے' اس کی ہدایت کو عام کرے۔ یہ کتاب رسول ﷺ کے ذریعے تم تک پہنچی ہے' اب اس کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا تمہارے ذمے ہے۔ لیکن یہود نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا : مثل

الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىۃَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡھَا ﴾ "مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے (جو اٹھوائے گئے تورات)' پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا (اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا) ﴿ کَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ﴾ "اس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ!" یہاں یہود کو اُس گدھے کے مثل قرار دیا گیا ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

عربی زبان میں سِفر اور سَفر دونوں کی جمع اَسفار آتی ہے۔ سِفر کے معنی ہیں کتاب۔ چنانچہ تورات میں شامل کتابوں (یا ابواب) کے لئے یہی لفظ مستعمل ہے' مثلاً سِفرِ پیدائش' سِفرِ تقویم (The Book of Genesis) وغیرہ۔ اس اعتبار سے یہاں آیت زیر نظر میں "اَسفار" کا لفظ اپنے اندر بڑی معنویت لئے ہوئے ہے۔

﴿ کَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ﴾ یہ تمثیل بھی نہایت بلیغ ہے۔ گدھے کی پیٹھ پر مکالماتِ فلاطوں کی سو جلدوں کی گٹھڑی باندھ کر رکھ دیجئے' اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہو گی اور نہ ہی حکمت اور دانائی کی کوئی بات اسے حاصل ہو گی۔ یہ مثال ہے اُس قوم کی جو کتابِ الٰہی کی حامل بنائی جائے اور پھر وہ اس کا حق ادا نہ کرے' اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے! اگرچہ یہ تمثیل ایک بار تو انسان کو چونکا دیتی ہے کہ توراۃ کی حامل امت کے لئے گدھے کی مثال! لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی علمی شے کے اندر شناعت اور گراوٹ کا جو پہلو موجود ہوتا ہے اسے واضح کرنے کے لئے کوئی ایسی تمثیل مؤثر ہوتی ہے جس سے طبیعت میں ایک دفعہ لرزش سی پیدا ہو جائے۔ فصاحت اور بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

تکذیب حالی

آگے فرمایا : ﴿ بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ﴾ "بُری ہے مثال اُس قوم کی جنہوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا" ـــــ یہاں لفظ "تکذیب" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تکذیب قول سے بھی ہو سکتی ہے اور عمل سے بھی۔ یعنی تکذیب باللّسان بھی ہو سکتی ہے اور بالحال بھی۔ یہ بھی تکذیب ہی کی ایک صورت ہوتی اگر بنی اسرائیل زبان سے صاف کہہ دیتے کہ تورات اللہ کی کتاب نہیں ہے' لیکن تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ بنی

اسرائیل نے اس معنی میں توراۃ کی تکذیب کبھی نہیں کی۔ ہاں تکذیبِ عملی کے وہ ضرور مرتکب ہوئے۔ وہ تکذیب عملی کہ جس کا نقشہ بدقسمتی سے آج اُمّتِ مسلمہ پیش کر رہی ہے کہ بجائے قرآن کو اپنا پیشوا' رہنما اور مشعلِ راہ بنانے کے امت کی عظیم اکثریت نے اسے طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑا ہے۔ قرآن نے اس طرزِ عمل کو تکذیب کے لفظ سے موسوم کیا ہے :﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ یہ اللہ کی آیات کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے! زبان سے چاہے قرآن مجید پر کتنا ہی ایمان کا دعویٰ کیا جائے' اگر قرآن مجید کو ہم نے اپنا امام نہیں بنایا' قرآن مجید کی رہنمائی کو عملاً اختیار نہیں کیا' قرآن مجید کے عطا کردہ ضابطے اور قانون کو نافذ نہیں کیا' اس کی تعلیمات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو استوار نہیں کیا تو گویا کہ اپنے عمل سے ہم قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہ تکذیب حالی ہے۔

اُمّتِ مُسلمہ کے لئے ایک پیشگی تنبیہہ

اب آیئے آیت کے آخری ٹکڑے کی طرف : ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ "اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔" نوٹ کیجئے' یہ وہی انداز ہے جو سورۃ الصف میں آچکا ہے۔ وہاں ظالم کی بجائے فاسق کا لفظ تھا : ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾ اسلوب اور اسٹائل بعینہٖ وہی ہے۔ یہ چیز اُن مشترک اوصاف میں سے ہے جو جڑواں سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس آیۂ مبارکہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کے ناطے ہر اُمت اور ہر قوم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' اگر اُن ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے تو درحقیقت یہ طرزِ عمل تکذیب کتاب کے مترادف ہے۔ یہ ایک پیشگی تنبیہہ تھی امت مسلمہ کو کہ اے مسلمانو! کہیں یہی معاملہ تم کتاب اللہ کے ساتھ نہ کر بیٹھنا! یہی وہ بات ہے جو حضور اکرم ﷺ کے ایک نہایت جامع فرمان میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ فرمایا : ((يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ)) "اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بنالینا"۔ وسادہ کہتے ہیں تکیے کو۔ یہ جملہ دو مفہوم دے رہا ہے (۱) تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے' اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ اور (۲) تکیے پر انسان سہارا لیتا ہے۔ اور ایک سہارا ذہنی

اور نفسیاتی بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے مفہوم یہ ہو گا کہ قرآن کو اس طرح کا ذہنی اور نفسیاتی سہارا نہ بنا بیٹھنا کہ ہم تو حامل کتاب ہیں' قرآن کے وارث ہیں' محمد ﷺ کے امتی ہیں۔ اس طرح کا ذہنی سہارا بسا اوقات بے عملی کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ روک دیا گیا کہ قرآن کو اس نوع کا ایک ذہنی سہارا نہ بنالینا' بلکہ تمہاری اصل توجہ اس جانب ہونی چاہئے کہ قرآن کے حوالے سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' قرآن کے ساتھ ہمارا عملی رویہ کیا ہونا چاہئے' اور یہ کہ قرآن مجید کے وہ کون کون سے حقوق ہیں جن کی ادائیگی کی فکر ہر مسلمان کو کرنی ہے اور ان کی ادائیگی کی عملی صورت کیا ہے؟

قرآن حکیم اور ہماری ذِمّہ داریاں

نبی اکرم ﷺ کی جس حدیث شریف کا ابھی ذکر ہوا تھا اس میں اس پیشگی تنبیہہ کے بعد کہ ((یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) "اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ اور ذہنی سہارا نہ بنالینا" آپؐ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان اساسات کو واضح فرمایا' کہ جن پر قرآن حکیم کے ساتھ اُمت مسلمہ کے صحیح تعلق کا دارومدار ہے' اور جن کی بجاآوری کی امت کو فکر کرنی چاہئے۔ فرمایا: ((وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ فِیْ اٰنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ)) "اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی"۔ "وَتَغَنَّوْهُ" "اور اسے خوش الحانی سے پڑھا کرو!" اس لئے کہ ہر انسان کو کسی نہ کسی درجے میں حسن سماعت سے بھی حصہ ملتا ہے۔ بندۂ مؤمن کے لئے اپنی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اچھی سے اچھی آواز میں اور بہتر سے بہتر انداز میں قرآن مجید کو پڑھے اور اس سے حظ حاصل کرے۔

آگے فرمایا: ((وَافْشُوْهُ)) "اور اسے پھیلاؤ"۔ اسے عام کرو! حضرت مسیح علیہ السلام نے بڑی پیاری بات فرمائی تھی کہ چراغ جلا کر اسے کہیں نیچے نہیں رکھا کرتے' بلکہ بلند مقام پر رکھتے ہیں تاکہ اس کی روشنی عام ہو۔ یہ نورِ ہدایت' قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے۔ جس کا نقشہ کھینچا گیا اس شعر میں ؎

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

بھٹکتے ہوئے قافلہ انسانیت کے لئے قندیل ہدایت یہی قرآن ہے۔ اس کو پھیلانے اور عام کرنے کی حضور ﷺ نے تاکید فرمائی۔ اسی کی جانب اشارہ فرمایا آپؐ نے اپنے آخری خطبے میں: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) "کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہئے کہ اس پیغام کو پہنچائیں ان تک جو یہاں موجود نہیں"۔ اور اس بات کو منطقی انتہا تک آپؐ نے پہنچا دیا اپنے اس قولِ مبارک کے ذریعے کہ: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً)) "پہنچاؤ میری جانب سے، خواہ ایک ہی آیت ہو"۔ چراغ سے چراغ اسی طور سے روشن ہو گا۔ اس ضمن میں آپؐ کا یہ ارشاد بھی نہایت اہم ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے" جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کو اپنی زندگی کا مشن بنالے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور متفق علیہ روایت ہے۔ یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ((وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) "اس پر غور و فکر کرو (اس کے مفاہیم و معنی کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرو) تاکہ تم فلاح اور کامیابی سے ہمکنار ہو سکو!"

اسی سلسلے میں ایک اور حدیث بھی جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، انتہائی توجہ کے لائق ہے۔ حضور ﷺ قرآن کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ((وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهُ)) "اور یہ کتاب وہ ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے" ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) "اور اہل علم اس سے کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے" ((وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ)) "بار بار کے پڑھنے کے باوجود (اس سے طبیعت اکتائے گی نہیں) اس پر پرانے پن کا کوئی احساس کبھی پیدا نہ ہونے پائے گا" ـــــ یہ ہے اللہ کی کتاب، جس کے حقوق کی ادائیگی کی ہم سب کو فکر ہونی چاہئے۔

اس موضوع پر اللہ کے فضل و کرم سے مَیں نے کسی زمانے میں مسجد خضریٰ لاہور میں دو تقریریں کی تھیں جو اَب ایک کتابچے کی شکل میں موجود ہیں، جس کا عنوان ہے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" یہ کتابچہ یوں سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث ہی کی وضاحت پر مشتمل ہے کہ "اے مسلمانو! حامل قرآن ہونے کے اعتبار سے پہچانو کہ تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں، تمہارے فرائض کیا ہیں! اس کو مانو جیسا کہ ماننے کا حق ہے،

اسے پڑھو جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے' اس کو سمجھو جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے' اس پر عمل کرو جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے' اور آخری ذمہ داری یہ کہ اس کو پھیلاؤ' اس کی تبلیغ و تبیین کرو جیسا کہ اس کی تبلیغ کا حق ہے"۔ چہار دانگِ عالم کو اس کے نور سے منور کرنے کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں خرچ کرنا اور کھپانا ہر مسلمان پر اس کتاب عزیز کا وہ حق ہے جسے ہم فراموش کئے ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کی بعثت چونکہ ((اِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ)) تھی' یعنی آپؐ تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں' لہٰذا حضور ﷺ نے تبلیغ و تعلیم قرآن کے ذریعے ایک مخصوص خطۂ زمین میں ایک انقلابِ عظیم برپا فرما دیا اور وہاں بسنے والی قوم کو وہ نسخۂ کیمیا قرآن مجید عطا فرما کر آپؐ اس دُنیا سے تشریف لے گئے۔ اب اُمت کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ وہ اس چراغ کو لے کر نکلے اور اس کے نور سے روئے ارضی کو منور کر دے ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

ذہن میں رکھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے اس فرضِ منصبی کا پورا شعور حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا تو دوسرے میں تلوار! ـــــ حقیقت یہ ہے کہ ایک مردِ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولا انسان کے تصور میں اُبھرتا ہے اس میں لازماً یہ بات شامل ہوتی ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور دوسرے میں تلوار۔ ایک طرف قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اس کے نورِ ہدایت کو عام کرنا اور دوسری جانب اللہ کے دین کے غلبے کے لئے اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں سے جہاد اور قتال' یہ تھا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا نقشہ!

قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل

یہ ہے وہ کام کہ جو حضور ﷺ اُمت کے سپرد فرما کر گئے تھے۔ اس سلسلے میں پیشگی تنبیہہ سورۃ الجمعہ میں کر دی گئی کہ دیکھنا کہیں اس کے برعکس تمہارا طرزِ عمل یہود کا سا نہ ہو جائے' جنہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ وفاداری نہیں کی تو اللہ نے انہیں اس گدھے کے مشابہ قرار دیا جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾

"نہایت بری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

یہ بات دوسری ہے کہ حضور ﷺ کا قولِ مبارک ہمارے حق میں پورا ہوا ہے کہ ((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) اور ہم بعینہٖ یہود کے نقش قدم پر چل رہے ہیں' چنانچہ قرآن کے ساتھ ہمارا تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یاسینِ او آساں بمیری

قرآن ہمارے نزدیک محض ایصالِ ثواب یا حصولِ ثواب کا ایک ذریعہ ہے یا موت کو آسان کرنے کا ایک نسخہ کہ مرتے ہوئے سورۂ یٰسین سنا دی جائے تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ہماری عملی زندگی کا قرآن حکیم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ ہماری رہنما کتاب ہے' نہ یہ ہماری امام ہے' نہ یہ قولِ فیصل ہے کہ ہمارے تمام فیصلے اسی پر مبنی ہوں' نہ اس پر ہماری زندگی کا نظام استوار ہے۔ تو گویا بعینہٖ وہ بات کہ جو یہود کو نشانِ عبرت کے طور پر پیش کر کے ہمیں بطور تنبیہہ کہی گئی تھی ہماری بدبختی اور بدقسمتی کہ ہم پر صادق آ رہی ہے اور ہم اس وقت اپنی موجودہ صورتِ حال سے اس کا ایک مکمل نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

اگلی آیات میں یہ حقیقت کھولی گئی ہے کہ کسی مسلمان اُمت میں زوال اور گمراہی کا پیدا ہو جانا کن اسباب سے ہوتا ہے! بڑی جامعیت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا گیا آیت ۶ میں:

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾

"(اے نبیؐ) کہئے: اے یہودیو! اگر تمہیں یہ زعم ہے (اگر تمہیں یہ خیالِ خام لاحق ہو گیا ہے) کہ تم اللہ کے بڑے دوست ہو (اس کے چہیتے اور محبوب ہو) لوگوں کو چھوڑ کر' تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!"

دوست سے ملاقات کی آرزو ہر شخص کو ہوتی ہے' اس سے دُوری تو انسان پر شاق گزرتی ہے۔

عملی اضمحلال کا اصل سبب

یہاں اشارہ ہوا اس بات کی طرف کہ کسی مسلمان اُمت میں عملی گمراہی اور اضمحلال کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں بالعموم یہ خیالِ خام راسخ ہو جاتا ہے کہ ہم بخشے بخشائے ہیں' ہم اللہ کے چہیتے ہیں: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ ہم اللہ کے برگزیدہ بندوں کی اولاد اور اس کے پسندیدہ بندوں کے ساتھ نسبت اور تعلق رکھنے والے لوگ ہیں' جہنم کی آگ ہمارے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہے۔ اس زعم اور بے بنیاد خیال کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تساہل اور عملی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر انسان اپنی نجات کے معاملے کو عمل کرنے کی بجائے ان تعلقوں اور نسبتوں پر موقوف سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں جھنجھوڑنے کے لئے ایک بڑی ہی عملی مثال سامنے لائی گئی کہ اگر تمہیں فی الواقع یہ خیال ہے کہ تمہیں خدا سے محبت ہے تو اس سے جلد سے جلد ملاقات کا جذبہ اور شوق تمہارے دل میں موجزن ہونا چاہئے۔ وہ جس کا نقشہ کھینچا علامہ اقبال نے ان الفاظ میں ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اپنے گریبان میں جھانکو' کیا واقعی یہ کیفیت ہے؟ کیا واقعی یہ زندگی تم پر اسی طرح بھاری گزر رہی ہے جیسے کہ حضور ﷺ نے نقشہ کھینچا تھا کہ: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ)) "یہ دُنیا ایک بندۂ مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے گلستان"۔ یا معاملہ اس کے برعکس ہے اور دُنیا سے محبت کی کیفیت وہ ہے جو سورۃ البقرۃ میں یہود کی بیان ہوئی:

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۛ ﴾ (البقرۃ: ۹۶)

کہ ان میں سے ہر ایک کی بڑی خواہش ہے کہ زندگی طویل ہو جائے' ایک ہزار برس تک

وہ اس دُنیا میں جی سکیں اور یہاں کا لطف اٹھا سکیں' اُن کی اصل کیفیاتِ باطنی تو یہ ہیں' دعویٰ کر رہے ہیں خدا کی محبّت کا اور خدا کے محبوب ہونے کا۔

یہ ہے وہ پریکٹیکل ٹیسٹ جو اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ اس پر اپنے آپ کو پرکھو۔

آیت کے اگلے ٹکڑے میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾

"اور یہ ہرگز ہرگز تمنا نہیں کر سکتے موت کی' بسبب اس کمائی کے جو اُن کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہوئی ہے"۔

سورۃ القیامہ میں ہم پڑھ آئے ہیں : ﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ ﴾ کہ انسان کو خوب معلوم ہوتا کہ وہ کہاں کھڑا ہے' کتنے پانی میں ہے۔ ﴿ وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ ﴾ خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں اور کتنے ہی بہانے تراش لے اور خواہ وہ اپنی استدلالی قوت سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کرا دے' لیکن اس سب کے باوجود اس کا ضمیر اسے بتا رہا ہوتا ہے کہ تم حقیقت میں کیا ہو ـــــ چنانچہ صاف فرما دیا کہ یہود اگرچہ خود کو اللہ کا لاڈلا اور چہیتا قرار دیتے ہیں' لیکن جو کچھ یہ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکے ہیں' جو کمائی انہوں نے کی ہے آخرت کے نقطۂ نگاہ سے' اس کے پیشِ نظر یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ "اور اللہ ظالموں سے بخوبی باخبر ہے"۔

اگلی آیت میں یہ مضمون اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ﴾ کہ (اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو' جس سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی۔ کتنا ہی بھاگو' کتنا ہی اس سے پہلو بچانے کی کوشش کرو' وہ سامنے آن کھڑی ہو گی۔ ﴿ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف کہ جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے ﴿ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ یہود سے ہے' لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تھا ان سورتوں میں اصل تخاطب اُمّتِ مُسلمہ سے ہے' ساری بات مسلمانوں سے ہو رہی ہے ۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اصل میں اُمّتِ مُسلمہ کو گویا پیشگی طور پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے اندر اگر عملی اضمحلال آئے گا' اپنے دینی مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے تم اگر پہلو تہی کرو گے تو اس کا اصل سبب یہ ہو گا کہ تمہیں یہ زعم لاحق ہو جائے گا کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں' ہم اس کے محبوبوں کی اولاد میں سے ہیں یا ہم اس کے محبوبوں اور اس کے مقربین بارگاہ کے دامن سے وابستہ لوگوں میں سے ہیں۔ یہ زعم ہے جو تمہیں عمل سے دُور کرتا چلا جائے گا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم دُنیا پرستی میں غرق ہوتے چلے جاؤ گے۔ دُنیا ہی تمہارا مطلوب و مقصود بنتی چلی جائے گی اور دوسرے یہ کہ موت کا خوف رفتہ رفتہ تم پر مسلط ہو جائے گا۔

ایک چونکا دینے والی حدیث

نبی اکرم ﷺ نے خبر دی تھی کہ اے مسلمانو! ایک وقت آئے گا کہ دُنیا کی قومیں تم پر ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے دعوت کا اہتمام کرنے والا کوئی شخص دسترخوان کے چنے جانے کے بعد مہمانوں سے کہتا ہے کہ آیئے تشریف لائے' کھانا تناول فرمایئے! اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیران ہو کر پوچھا کہ مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ حضور! کیا اس زمانے میں ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! ((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ)) تعداد تو تمہاری بہت ہو گی' نوے کروڑ' ایک ارب اور نامعلوم کتنی! لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہو گی کہ جیسے کسی جگہ اگر سیلاب آ جائے تو سیلاب میں پانی کے ریلے کے اوپر کچھ جھاڑ جھنکار ہوتا ہے' کچھ جھاگ ہوتا ہے ((وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ)) اس سے زائد تمہاری حیثیت نہیں ہو گی' دُنیا میں تمہاری اہمیت اس سے بڑھ کر نہ رہے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر سوال کیا کہ حضور! ایسا کیوں ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا: تمہارے اندر ایک بیماری پیدا ہو جائے گی جس کا نام "وَھن" ہے۔ سوال کیا گیا: "مَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" کہ حضورؐ! وہ وہن کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ)) دُنیا کی محبت اور موت سے نفرت ـــــ یہ بیماری جب تم میں

پیدا ہو جائے گی' جب دُنیا تمہاری محبت کا مرکز بن جائے گی اور موت سے تم دُور بھاگنے لگو گے تو بہت بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود تم اقوامِ عالم کے لئے لقمۂ تر بن جاؤ گے ـــــ لیکن ظاہر بات ہے کہ کوئی اپنی درازیٔ عمر کے باعث اللہ کی پکڑ سے بہرحال بچ نہیں سکے گا' اسے بالآخر اپنے رب کی طرف لوٹنا ہی ہو گا اور وہاں اس کا حساب چکا دیا جائے گا۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ مکمل ہوا جو چار آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں ذکر اگرچہ سابقہ اُمت مسلمہ یہود کا ہے' لیکن اصلاً یہ ایک آئینہ ہے کہ جس میں نئی اُمت مسلمہ کو آئندہ کی تصویر دکھائی جا رہی ہے کہ جیسے وہ حامل کتاب بنائے گئے تھے اس طرح تم بھی حامل قرآن بنائے جا رہے ہو' جیسے وہ وارثِ کتاب بنے تھے ویسے ہی تم بھی وارثِ کتاب بنائے گئے ہو' دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ جو معاملہ انہوں نے کیا تھا تم بھی قرآن کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگو!! یہ ہے درحقیقت اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصّے اور دوسرے حصّے کے مضامین کے مابین ربط و تعلق۔ چونکہ انقلابِ محمدیؐ کا آلہ قرآن حکیم ہے اور حضور ﷺ کی بعثت قیامت تک آنے والی پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے' لہٰذا جس عمل کو حضور ﷺ نے جاری رکھا ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ اور جس کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کر دیا' اسی عمل کو جاری رکھنا اور آگے چلانا اُمت کی ذمہ داری ہے۔

اس کے لئے اساسی منہاج وہی ہو گا جو حضور اکرم ﷺ نے اختیار کیا' جس میں مرکز و محور کی حیثیت قرآن حکیم کو حاصل تھی۔ یہاں سورۃ الجمعہ کا پہلا رکوع ختم ہوا۔

حکمت واَحکامِ جمعہ

سورۃ الجمعہ کا دوسرا رکوع تین آیات پر مشتمل ہے اور اس میں حکمت و احکامِ جمعہ کا بیان ہے۔ یہاں ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے مرکزی مضمون اور عمود کے ساتھ نظامِ جمعہ کا کیا تعلق ہے۔ اس لئے کہ بظاہر تو معاملہ غیر متعلق سا نظر آتا ہے! ـــــ تاہم پہلے ان آیات کا ایک رواں ترجمہ کر لینا مفید ہو گا۔ فرمایا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى

ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○

"اے اہل ایمان! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو لپکو اللہ کی یاد کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو! یہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھو!"

ذہن میں تازہ کیجئے' سورۃ الصّف کا دوسرا رکوع بھی شروع ہوا تھا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے اور اس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے تھے کہ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ یہ مشابہتِ لفظی بھی بہت قابل توجہ ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے :

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ○

"جب نماز ادا کی جا چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو' اور اللہ کا ذکر جاری رکھو کثرت کے ساتھ' تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (اب ایک متعین واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) جب انہوں نے دیکھا کوئی کاروبار یا کوئی اور دلچسپی کی چیز تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبیؐ) کھڑے ہوئے۔ کہہ دیجئے جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے تجارت سے بھی اور دلچسپیوں کی چیزوں (لہو ولعب) سے بھی' اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔"

ان تین آیات میں' جیسا کہ ترجمے سے واضح ہو گیا' ساری بات نمازِ جمعہ اور خطبۂ جمعہ کی ہو رہی ہے۔ جمعہ کی فرضیت اس درجے واضح کی گئی کہ صریحاً فرما دیا گیا کہ جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو ہر نوع کا کاروبارِ دنیوی ترک کر دیا جائے' ہمہ تن متوجہ ہو جایا جائے! یہ ساری باتیں جو آ رہی ہیں تو پہلے جیسا کہ عرض کیا گیا تھا یہ سمجھئے کہ اس کا ربط کیا ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں....

درحقیقت یہ نظامِ جمعہ جس کو ہم نے ایک رسم بنا لیا' ایک نہایت عظیم اور مبنی بر حکمت نظام ہے۔ اس معاملے میں تو شاید مسلمانوں کو دنیا کی کوئی قوم بھی مات نہ دے سکے کہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک رسم بنا کر رکھ دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ——

نتیجہ یہ ہے کہ اعمال کی محض صورت اور شکل باقی رہ جاتی ہے اور اس کی روح غائب! یہ بات نظروں کے سامنے رہتی ہی نہیں کہ وہ عمل کس لئے تھا' اس کا مقصد کیا تھا؟ بس عمل کی ظاہری صورت باقی رہتی ہے اور اس کی حیثیت ایک رسم (Ritual) سے زیادہ نہیں ہوتی ؎

رہ گئی رسم اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی!

اسی طرح کا معاملہ اجتماعِ جمعہ کا ہے۔ آج اس گئے گزرے دَور میں بھی مسلمانوں میں ابھی کثیر تعداد میں وہ لوگ موجود ہیں جو جمعہ کے لئے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آتے ہیں' نہا دھو کر' اچھے صاف ستھرے کپڑے پہن کر' خوشبو لگا کر آتے ہیں' لیکن یہ بات بالعموم پیشِ نظر نہیں ہوتی کہ اس نظامِ جمعہ کا اور اس سب اہتمام کا حاصل کیا ہے' اس کی غرض و غایت کیا ہے' اس کی حکمت کیا ہے! ـــــ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس جمعہ کی اصل اہمیت خطبہ جمعہ کی وجہ سے ہے' ورنہ جمعہ کی نماز میں فرض رکعتوں کی تعداد نمازِ ظہر سے بھی نصف رہ جاتی ہے جس کا کہ وہ قائم مقام بنتی ہے۔ نماز ظہر کی چار رکعتیں ہیں جب کہ نماز جمعہ میں کل دو رکعات فرض شامل ہیں۔ گویا نماز کی رکعتوں کی تعداد کم ہو گئی۔ جمعہ کو جس چیز نے "جمعہ" بنایا ہے وہ خطبہ جمعہ ہے' اور خطبہ جمعہ کی غرض و غایت کیا ہے' اسے مسلم شریف کی ایک روایت کے حوالے سے سمجھئے کہ حضور ﷺ خطبہ جمعہ میں کیا کیا کرتے تھے؟ ـــ "كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ" ـــــ "آپ ﷺ قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور لوگوں کو تذکیر فرماتے تھے" یاددہانی کیا کرتے تھے۔ یہ تذکیر بالقرآن وہی ہے جس کا ذکر سورۂ قٓ کی آخری آیت میں آیا ہے: ﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾ یعنی "اے نبی! اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر فرمایئے (اور یاددہانی کراتے رہئے) ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔"

حکمتِ جمعہ

خطبہ جمعہ دراصل عوامی سطح پر تذکیر بالقرآن ہی کی ایک ہمہ گیر شکل ہے۔ یہ گویا تعلیم بالغاں کا ایک عظیم نظام ہے جو اُمّت میں رائج کیا گیا کہ کوئی نائبِ رسول منبرِ رسول پر

کھڑا ہو اور قرآن حکیم کی آیات کے ذریعے تذکیر و نصیحت کا وہی فریضہ سرانجام دے جو درحقیقت انقلابِ محمد ﷺ کی جڑ اور بنیاد ہی نہیں' مرکز و محور بھی ہے۔ یعنی ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ اسی نبوی عمل کو دوام بخشا گیا اور اسے امت کے اندر ایک مستقل عمل کی حیثیت سے جاری کر دیا گیا نظامِ جمعہ کی صورت میں' کہ لوگ خطبہ سننے کے لئے پورے اہتمام سے نہا دھو کر آئیں' اعصاب چاق و چوبند ہوں' ماحول معطر ہو۔ غور کیجئے' یہ ساری ہدایات کیوں دی گئیں! نبی اکرم ﷺ نے اس معاملے میں یہاں تک فرمایا کہ کیا تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنے ان کپڑوں کو جو محنت مزدوری کے وقت پہنتے ہو' علیحدہ رکھو اور جمعہ کے لئے ایک صاف ستھرا جوڑا علیحدہ تیار رکھو؟ تاکہ جب مسلمان جمع ہوں تو وہاں کا ماحول پسینے کی بدبو سے منغض نہ ہو بلکہ پاک صاف اور معطر ماحول ہو کہ مسلمان خطبہ جمعہ پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ سن سکیں اور کوئی نائب رسول جب عمل نبویؐ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے آیات قرآنی کے ذریعے سے وعظ و نصیحت کرے تو ان باتوں کو سننے اور سمجھنے کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے۔

ہفتہ وار اجتماعات کی ضرورت

یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ ہر انقلابی جماعت کے لئے اس طرح کے اجتماعات کا اہتمام کرنا ایک لازمی امر ہے۔ ہر انقلابی گروہ یا جماعت کا کوئی نہ کوئی لٹریچر ہوتا ہے جو اس کے اساسی افکار و نظریات پر مشتمل ہوتا ہے اور کسی بھی انقلابی گروہ یا جماعت کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اساسی لٹریچر کے ساتھ اپنے ذہنی ربط و تعلق کو برقرار رکھے اور اس لٹریچر کے ذریعے وقتاً فوقتاً اپنے افکار و نظریات کو تازہ کرتی رہے۔ مختلف جماعتیں اسی غرض سے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کیا کرتی ہیں۔ مسلمان بھی دراصل ایک نظریاتی گروہ کے افراد ہیں۔ اس گروہ یا اُمت کے سامنے ایک عظیم مشن ہے' فرائض رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری اسی اُمت کے کاندھوں پر آئی ہے' انقلاب نبویؐ کی عالمی سطح پر تکمیل اُمت کا مشن قرار پایا ہے اور اس انقلابی جماعت کا لٹریچر ہے قرآن مجید۔ ان کے فکر کو تازہ کرنے اور ان کے نقطہ نظر کو صحیح رکھنے کے لئے اس ابدی لٹریچر کی

پیہم اور مسلسل تعلیم کا نظام جاری کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ اس خطبے کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ فرمایا گیا کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو ایک دوسرے سے کلام نہ کرو' یہاں تک کہ دوران خطبہ اگر تم نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ خاموش رہو تو اتنا کہنا بھی ایک ناپسندیدہ حرکت ہے۔ ((اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ اَنْصِتْ فَقَدْ لَغَوْتَ)) کہ اگر کسی نے کوئی لغو حرکت کی کہ دوران خطبہ بولنا شروع کر دیا اور تم نے اس سے کہا کہ "چپ ہو جاؤ" تو تم نے بھی ایک لغو حرکت کا ارتکاب کیا۔ پوری خاموشی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنو۔ اللہ کے پاک کلام کی جو تعلیم و تلقین ہو رہی ہے اور اس کے ذریعے سے جو تذکیر و نصیحت کا عمل خطبے کی صورت میں جاری ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ!

خطبہ جمعہ کی اہمیت کا اندازہ حضور ﷺ کے اس فرمان سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب خطبے کا آغاز ہو جاتا ہے تو وہ فرشتے کہ جو مسجد کے دروازوں پر بیٹھے آنے والوں کی حاضری کا اندراج کر رہے ہوتے ہیں' اپنے صحیفے اور رجسٹر بند کر دیتے ہیں اور وہ خود ہمہ تن خطبے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جمعہ میں صرف وہی لوگ حاضر شمار ہوتے ہیں جو وقت پر آئیں اور مکمل خطبے کی سماعت کریں۔ ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ اوّل تو وہ خطبہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم! ـــــ اس کی تلافی کے لئے اگر تقریروں اور وعظوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تو بڑے دکھ کے ساتھ یہ عرض کر رہا ہوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان تقریروں میں اور سب کچھ ہوتا ہے سوائے قرآن کے! اس میں سیاست پر بات ہو گی' فرقہ واریت پر گرما گرم گفتگو ہو گی' اس میں کہانیاں ہوں گی' لطیفے بیان ہوں گے' نہیں ہو گا تو بس قرآن نہیں ہو گا جس کے لئے یہ سارا نظام تجویز کیا گیا! جس کے لئے یہ سارا کھکیڑ مول لیا گیا ہے!

یہ ہے حکمت و احکامِ جمعہ کا مضمون جو اس سورۂ مبارکہ میں بڑی جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ جمعہ سے متعلق احکام دوسرے رکوع میں وارد ہوئے اور اس کی حکمت کا بیان گویا پہلے رکوع میں ہو گیا کہ وہی نبوی عمل جس کا بیان چار اصطلاحات کی صورت میں ہوا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اس کو دوام اور تسلسل عطا کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ بلاشبہ یہ تعلیم بالغاں کا ایک عظیم نظام ہے۔ چشمِ تصوّر سے دیکھئے آج اس گئے گزرے دَور میں بھی لاکھوں انسان جمعہ کے لئے بڑے اہتمام سے

تیار ہو کر آتے ہیں ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی"۔ افسوس کہ یہ عظیم عمارت فی الواقع اب کھنڈر بن چکی ہے۔ اس کی حکمت اور اس کی غرض و غایت ہمارے پیش نظر ہی نہیں رہی' جمعہ اب ہمارے ہاں بس ایک رسم بن کر رہ گیا ہے اور اس کو رسم کی حیثیت سے ادا کرنے والے آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ہماری کوتاہی کے باعث اس سے وہ مقصود حاصل نہیں ہو رہا جو کہ اس مبارک عبادت سے حاصل ہونا چاہئے۔

احکام جمعہ ۔ بعض دیگر ہدایات

بہرکیف یہ ہے وہ ربط و تعلق جو دوسرے رکوع کی تین آیات کا اس سورۂ مبارکہ کے عمود کے ساتھ بنتا ہے۔ اس دوسرے رکوع میں بعض مضامین اور بھی ہیں جو اگرچہ سورۃ کے عمود اور ربط کلام کے اعتبار سے ضمنی قرار پائیں گے لیکن بہرحال ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ علم و حکمت کا ایک قیمتی موتی ہے۔ ایک تو خطبہ جمعہ کی خصوصی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ﴾ کہ لپکو اللہ کے ذکر کی طرف! ـــــ خیال رہے کہ نماز کے لئے دوڑ کر جانے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے' یہ وقار کے منافی ہے۔ ورنہ یہاں لفظی ترجمہ تو یہی ہو گا کہ دوڑو اللہ کی یاد کی طرف۔ لیکن ہم اس سے مراد لیں گے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ۔

اگلے الفاظ بھی نہایت قابل توجہ ہیں: "وَذَرُوا الْبَیْعَ" کاروبار ترک کر دو! "ذَرُوا" امر کا صیغہ ہے اور یہ قاعدہ سب کے علم میں ہے کہ "اَلْاَمْرُ لِلْوُجُوْبِ"۔ چنانچہ اذانِ جمعہ کے بعد کاروبارِ دُنیوی مطلقاً حرام ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ ذہن میں رہے کہ یہ حکم اصلاً اذانِ ثانی سے متعلق ہے' اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ دوسری اذان کا اضافہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں کیا گیا جب مدینہ منورہ نے وسعت اختیار کر لی۔ لہٰذا اس حکم کا پوری شدت کے ساتھ اطلاق تو ہو گا اذانِ ثانی کے بعد' لیکن تبعًا یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اذانِ اولیٰ کے بعد جمعہ کی تیاری کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جانا اور مسجد کی طرف لپکنا اس آیت کے منشا میں شامل ہے۔

اس آیت میں لفظ "ذکر" بھی خصوصی طور پر لائق توجہ ہے۔ یہاں ذکر سے مراد ہے

خطبہ جمعہ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' خطبہ دراصل قرآن کی تعلیم ہی کا ایک ذریعہ ہے۔ خطیب کا کام یہ ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے حوالے سے تذکیر کرے' وعظ و نصیحت کرے۔ اور قرآن مجید خود اپنے آپ کو بھی "الذِّکر" قرار دیتا ہے۔ سورۃ الحجر کی اس آیت میں بھی جو کثرت سے بیان کی جاتی ہے' قرآن کے لئے "الذکر" کا لفظ آیا ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ (الحجر : ۹)

"یقیناً ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں"۔

اُمّتِ مُسلمہ کے لئے خصوصی سہولت

اس کے بعد فرمایا کہ جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ۔ ﴿ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ ﴾ اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ سابقہ امت میں یوم السبت (ہفتے کا دن) کُل کا کُل عبادت کے لئے مخصوص تھا اور اس میں کاروبارِ دنیوی مطلقاً حرام تھا۔ لیکن اُمت محمد ﷺ کے لئے اس معاملے میں آسانی پیدا کی گئی ہے اور وہ یہ کہ صرف اذانِ جمعہ سے لے کر اختتامِ نماز تک دُنیوی کاروبار اور تجارتی لین دین کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اجازت دے دی گئی کہ جب نماز ادا ہو چکے تو اب تمہیں اختیار ہے کہ جاؤ اور تلاشِ معاش میں مصروف ہو جاؤ۔ اس ضمن میں جو الفاظ یہاں لائے گئے ہیں وہ نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ فرمایا ﴿ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ کہ جو کچھ تم کماؤ گے اسے اللہ کا فضل سمجھو' اسے اپنی محنت کا نتیجہ سمجھنا درست نہ ہو گا۔ محنت یقیناً تمہیں کرنی ہے' لیکن جو رزق اور روزی تمہیں عطا ہوئی ہے یہ اللہ کا فضل ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی تاکید فرما دی: ﴿ وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی اللہ کا ذکر جاری رہنا چاہئے۔ اپنے تمام اوقات کو ذکرِ الٰہی سے آباد رکھنے کی کوشش کرو ـــــ "اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ دوامِ ذکر کی بڑی فضیلت ہے۔ "اِسْتِحْضَارُ اللّٰهِ فِی الْقَلْبِ" یعنی اللہ کی یاد کو دل میں تازہ رکھنا پسندیدہ ہی نہیں مطلوب بھی ہے۔ اور یہاں تو اسے فلاح کے لئے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیات کے حوالے سے

ذکر کے مفہوم پر کچھ باتیں قدرے تفصیل سے عرض کی جا چکی ہیں' ان کو ذہن میں تازہ کیجئے!

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت میں ایک متعین واقعے کے حوالے سے تنقید کر کے خطبہ جمعہ کی اہمیت کو مزید واضح کر دیا گیا کہ خطیب جب خطبہ دے رہا ہو تو اس حال میں اسے چھوڑ کر کسی تجارتی لین دین یا کسی دیگر مصروفیت کی جانب متوجہ ہو جانا نہایت نامناسب طرزِ عمل ہے' خواہ کسی اشد ضرورت کے تحت یہ معاملہ کیا گیا ہو۔ مختصراً یہ کہ سورۂ مبارکہ گویا گھوم رہی ہے اس مرکزی آیہ مبارکہ کے گرد: ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ اور یہی ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا بنیادی طریق کار اور انقلابِ محمدیؐ کا اساسی منہاج!

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ' وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ○○

"خطباتِ خلافت"

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد کے چار خطبات کا مجموعہ

سفید کاغذ' عمدہ طباعت' صفحات 212

قیمت : (اشاعت خاص مجلد) 80 روپے اشاعت عام : 45 روپے

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور (فون : 03۔5869501)

ربیع الاول ۱۴۰۱ھ میں پاکستان ٹیلیویژن پر پیش کیا جانے والا سلسلۂ تقاریر

رسول کامل ﷺ

مقرر : ڈاکٹر اسرار احمد

(۸)

انقلابِ نبویؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ... ﴾ (سبا : ۲۸)

خاتم النبیین اور آخر المرسلین ہونے کی حیثیت سے آں حضور ﷺ پر نبوّت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا بلکہ اتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ ایک بعثت خصوصی الی اہلِ عرب اور ایک بعثتِ عمومی پوری نوعِ انسانی کی طرف۔ اگرچہ نظری طور پر تو یہ بھی ممکن تھا کہ آنحضور ﷺ اپنی ان دونوں بعثتوں کے ضمن میں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کا آغاز بیک وقت فرما دیتے' یعنی جیسے ہی آپ ﷺ نے مکّہ مکرمہ میں اپنی رسالت کا دعویٰ ظاہر فرمایا اُسی وقت آپؐ امراء و سلاطین کے نام بھی خطوط ارسال فرما دیتے' لیکن آپؐ نے اپنی دعوت و تبلیغ میں جس حکمت اور جس تدریج کو پیش نظر رکھا اس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ۶ھ تک جبکہ صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور گویا کہ اہل عرب نے نبی اکرم ﷺ کی قوت کو تسلیم کر لیا' آنحضور ﷺ نے اپنی تمام تر توجہات اندرونِ ملک عرب مرتکز رکھیں اور بیرونِ ملک عرب اپنی کسی دعوتی کوشش کا آغاز نہیں فرمایا۔ البتہ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے دعوتی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے قیصر روم کے نام بھی' کسریٰ فارس کے نام بھی اور آس پاس کی دوسری چھوٹی حکومتوں جیسے مقوقس شاہِ مصر' نجاشی شاہِ حبشہ' رؤسائے یمامہ اور رؤسائے شام کے نام بھی۔

یہ بات واضح رہے کہ روم اور فارس کو گویا اُس وقت کی دو سپر پاورز کی حیثیت حاصل تھی ـــــ آنحضور ﷺ کی اصل اہم سفارتیں انہی دو سلطنتوں کی طرف ارسال

ہوئیں۔ حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ قیصر روم کے دربار میں اور حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کسریٰ کے دربار میں بھیجے گئے۔ قیصر اور کسریٰ کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے بالکل متضاد سامنے آیا۔ قیصر عیسائی تھا' صاحب علم تھا' وہ جانتا تھا کہ نبی آخر الزمان کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ اس نے نامۂ مبارک کی بھی قدر کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی بھی عزت افزائی کی۔ بلکہ ہمیں تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک بھرپور کوشش کی کہ کسی طرح پوری سلطنت اسی طرح اسلام کو قبول کرلے جیسے ماضی میں پوری سلطنتِ روما نے عیسائیت کو اختیار کیا تھا' تاکہ اس کی بادشاہت اور حکومت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ لیکن افسوس وہ اس میں ناکام رہا اور یہی بادشاہت' سیادت اور دنیوی اقتدار اس کے پاؤں کی بیڑی ثابت ہوا اور وہ دولت ایمان سے محروم رہ گیا۔ اس کے برعکس رویہ سامنے آیا کسریٰ کا' اس نے نامۂ مبارک چاک کردیا اور نہایت غیظ و غضب کے عالم میں اپنے یمن کے گورنر بازان کو یہ حکم بھیجا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تبصرہ فرمایا کہ "کسریٰ نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پرزے کردیئے ہیں"۔ جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں یہ پیشین گوئی فی الواقع پوری ہوئی۔ اسی طرح مقوقس شاہِ مصر کی طرف سے بھی ہرقل قیصر روم ہی کا سا طرزِ عمل سامنے آیا' بلکہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کی تکریم بھی کی اور ہدایا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ارسال کئے۔ نجاشی والی حبشہ پہلے ہی ایمان لاچکے تھے۔ الغرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ اس طرح ملک سے نکل کر اطراف و جوانب کی طرف وسعت اختیار کرگیا۔

اس ضمن میں یہ واقعہ پیش آگیا کہ رؤسائے شام میں سے ایک شخص شُرَحْبِیل بن عمرو غسّانی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت حارث بن عمیر اَزدی رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا۔ یہ تھا واقعہ جس کے نتیجے میں قصاص کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جیش روانہ فرمایا اور یہ گویا کہ تمہید ہوگئی سلطنت روما کے ساتھ ایک مسلح تصادم کی۔ چنانچہ تین ہزار کا ایک لشکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اس قتل کے قصاص کے لئے روانہ کیا' اِدھر سے شُرَحْبِیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر چلا۔ جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ تین ہزار اور ایک لاکھ

کے مابین ظاہر ہے کہ کسی مقابلہ کا کوئی سوال نہیں تھا! لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات کو سامنے رکھا کہ ہم تو اصل میں شہادت کے طلب گار ہیں' ہمارے لئے فتح یا شکست بے معنی ہے' ہمیں تو جامِ شہادت نوش کرنا ہے۔ چنانچہ موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ حضور ﷺ کے حکم کے مطابق ان کے بعد حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے علم سنبھالا۔ وہ بھی شہید ہوئے اور اُن کے جسم پر زخموں کو گنا گیا تو نوے (۹۰) زخم تھے۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ انصاری نے علم سنبھالا۔ وہ بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی جنہیں حضور ﷺ نے اس معرکہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو کامیابی سے دشمن کے نرغے سے بچالانے پر سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ کا خطاب عطا فرمایا۔ اگرچہ مقابلہ تو بہرحال نہیں ہو سکتا تھا اور عام معنی میں فتح حاصل ہونی عقلاً محال تھی' لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمالِ تدبیر کے ساتھ اپنے لشکر کو غنیم کے نرغے سے نکال لیا اور واپس تشریف لے آئے۔ جنگ موتہ جو جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی ہے' یہ گویا کہ نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست کا وقت کی ایک عظیم مملکت سلطنت روما کے ساتھ پہلا مسلح تصادم تھا۔

اس کے بعد کچھ خبریں ملنی شروع ہوئیں کہ رومی فوجیں جمع کر رہے ہیں اور حملے کا ارادہ رکھتے ہیں' غسان کے تمام قبائل مجتمع ہو کر مدینہ منورہ کی طرف پیش قدمی کے نقشے بنا رہے ہیں' تو نبی اکرم ﷺ نے خود اپنی طرف سے اقدام فرمانے کے لئے تمام مسلمانوں میں ایک نفیر عام کا اعلان کروا دیا۔ یہ وقت گویا کہ بڑا ہی نازک تھا۔ سلطنت روما کے ساتھ ٹکراؤ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ سلطنت کہ جس کے پاس لاکھوں کی Standing Armies موجود تھیں' جن کی فوجیں پوری طرح تربیت یافتہ اور قواعد حرب سے پورے طور پر آگاہ اور ہر طرح کے اسلحہ سے پورے طور پر مسلح تھیں' ان کے ساتھ مسلح تصادم کا مرحلہ درپیش تھا۔ چنانچہ نفیر عام ہوئی کہ ہر صاحب ایمان کو اس معرکے میں شرکت کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں صرف اسی ایک موقع پر نفیر عام ہوئی ہے جسے غزوۂ تبوک یا سفر تبوک کا نام دیا گیا ہے جو ۹ھ میں پیش آیا۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ شدید گرمی کا موسم تھا' ایک طویل مسافت طے کرنی تھی' سلطنت روما سے ٹکراؤ تھا' قحط کی کیفیت تھی' اجناس کی کمی تھی' رسد ساتھ لے جانے کے

لئے موجود نہ تھی۔ اُس وقت اہل نفاق کا نفاق پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں جہاں اُس وقت کے حالات پر بڑا بھرپور تبصرہ ہے' منافقین کی طرف سے اس ضمن میں جو جو کچھ کہا گیا اس کا پورا ذکر موجود ہے۔

الغرض اہل ایمان نے پورے صبر اور ثبات کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ تیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر نبی اکرم ﷺ نے تبوک کی طرف کوچ کیا جس میں دس ہزار کا رسالہ بھی شامل تھا۔ حضور ﷺ سرحد شام پر پہنچ کر تبوک کے مقام پر قیام پذیر ہوئے اور بیس دن تک وہاں قیام فرما رہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہرقل قیصر روم نے مقابلے سے پہلو تہی اختیار کی' اور اس کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب علم تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام کا نام لیوا' آسمانی کتابوں کو جاننے والا تھا۔ وہ پہچان چکا تھا کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ تو گویا کہ یہ بات اس کے سامنے بالکل واضح تھی کہ اللہ و رسول (ﷺ) سے مقابلہ کرنے کے معنی یقینی شکست کے ہیں' لہٰذا وہ پہلو تہی کرتا رہا' طرح دیتا رہا' مقابلے میں نہ آیا' حالانکہ اس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں مسلح فوج موجود تھی۔

تبوک میں حضور ﷺ بیس دن تک قیام فرما رہے۔ آس پاس کے جو بھی قبائل تھے ان کے سردار اور رئیس آکر حضور ﷺ کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کرتے رہے۔ اور اس طرح عرب کی جو ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی اسے گویا کہ جزیرہ نمائے عرب میں پورا استحکام حاصل ہو گیا۔ اس کا رعب پورے عرب پر چھا گیا اور اس کی دھاک اطراف و جوانب پر بیٹھ گئی۔ اور نبی اکرم ﷺ بغیر کسی مسلح تصادم کے مدینہ تشریف لے آئے۔ اس کے بعد اپنے مرضِ وفات میں نبی اکرم ﷺ نے پھر ایک جیش تیار کر رکھا تھا جس کی سرکردگی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو دی گئی تھی۔ یہ ہے درحقیقت تمہید اُس تصادم کی جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری دَور میں وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں کے ساتھ' جس کا آغاز ہو گیا تھا اور یہی بعد میں خلافت راشدہ کے دوران اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۹ھ میں نبی اکرم ﷺ نے حج کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج کی حیثیت سے متعین فرما کر روانہ کیا۔ لیکن جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ روانہ ہو چکے تھے' سورۂ توبہ کی

ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ گویا کہ حضور ﷺ کو حکم دے دیا گیا کہ اعلانِ عام کر دیا جائے اس حج کے موقع پر تمام مشرکین کے لئے کہ عرب کے تمام وہ لوگ کہ جو شرک پر کاربند رہنا چاہیں، وہ کان کھول سن لیں کہ اب ان کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی معاہدہ نہیں ہے اور اُن سے کامل براءت ہے۔

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ○ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ○ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

(التوبہ : ۱-۳)

"اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ کہ اللہ منکرینِ حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کیلئے کہ اللہ مشرکین سے بریُ الذمّہ ہے اور اس کا رسول بھی۔"

اب ان کو آخری الٹی میٹم دیا جا رہا ہے کہ چار مہینوں کی مدت کے ختم ہونے کے فوراً بعد اُن کے خلاف عام اقدام شروع کر دیا جائے گا۔ اب یا وہ اسلام قبول کر لیں اور اگر کفر اور شرک پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو جزیرہ نمائے عرب کو خیرباد کہہ کر جہاں سینگ سمائیں چلے جائیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ اعلانِ عام کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور ۹ھ کے حج کے موقع پر یہ اعلانِ عام ان قبائل کے وفود کے سامنے کر دیا گیا جو حج کے لئے آئے ہوئے تھے۔

۱۰ھ میں اب بنفس نفیس تشریف لاتے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے لئے۔ اس حج کے موقع پر معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے کونے کونے سے سوا لاکھ کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہوئے۔ گویا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی تیئس برس کی محنتِ شاقہ کا حاصل میدانِ عرفات میں جمع ہو گیا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے عرفات میں بھی

خطبہ دیا اور منیٰ میں بھی خطبے ارشاد فرمائے۔ اور ان ہی خطبات کو یکجا کر کے خطبۂ حجتہ الوداع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک جانب تو حضور ﷺ نے ابتداء ہی میں اپنے وصال کی خبر دے دی کہ :

"لوگو! شاید کہ دوبارہ اس مقام پر ملنا نصیب نہ ہو!"

اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کو Finishing touches دیئے۔ اہم چیزوں کا دوبارہ اعادہ کیا۔ اسی کے ضمن میں آپؐ نے فرمایا :

"پوری نوعِ انسانی سماجی اعتبار سے بالکل برابر ہے۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔"

یہ ہے وہ چیز جس کا بالخصوص ذکر کرتا ہے ایچ جی ویلز اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ یہ اصول جو محمدؐ عربی (ﷺ) نے بیان فرمایا، یہ محض ایک وعظ نہیں تھا، واقعتاً محمد (ﷺ) نے ان ہی اصولوں پر ایک معاشرہ بالفعل قائم کر دیا۔

خطبے کے آخر میں اب حضور ﷺ نے لوگوں سے ایک سوال کیا :

((اَلاَ هَلْ بَلَّغْتُ؟)) "لوگو! میں نے پہنچا دیا یا نہیں؟"

اور مجمع عام نے بیک زبان یہ جواب دیا :

اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ

"ہاں حضور ﷺ! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق تبلیغ ادا کر دیا، حق امانت ادا کر دیا، حق نصیحت ادا کر دیا۔"

حضور ﷺ نے تین مرتبہ سوال کیا اور تین ہی مرتبہ پورے مجمع نے یہی جواب دیا اور اس کے بعد آپؐ نے تین مرتبہ انگشت شہادت سے اشارہ کیا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اشارہ پہلے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف کیا اور فرمایا :

((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ))

"اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ!"

یہ گویا کہ عملی تفسیر ہے سورۂ فتح کی اس آیت کے آخری حصے کی کہ :

(باقی صفحہ ۵۱ پر ملاحظہ کیجئے)

دورِ حاضر کا ترجمان القرآن اور داعیٔ قرآن

علاّمہ اقبال

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کا ۹/ نومبر ۲۰۰۰ء کو ایوانِ اقبال میں خطاب

خطبہ مسنونہ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

میرے نزدیک عہدِ حاضر میں عظمت قرآن کا سب سے بڑا انکشاف علامہ اقبال پر ہوا ہے۔ اس لئے علامہ اقبال کو عہد حاضر کا ترجمان القرآن کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ لقب اصل میں امام ابنِ تیمیہؒ کے انتقال کے وقت ان کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اُس دَور کے ترجمان القرآن بے شک ابنِ تیمیہ تھے' لیکن اس دور کے ترجمان القرآن اور سب سے بڑے داعیٔ قرآن علامہ اقبال ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اِس دَور میں قرآن مجید کے عظیم ترین معجزہ ہونے کی سب سے بڑی علامت علامہ اقبال کی ذات ہے۔ مزید برآں عہدِ حاضر میں اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے صریح لائحہ عمل دینے والے بھی علامہ اقبال ہی ہیں۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ مَیں نے بہت بڑے دعوے کئے ہیں' لیکن میں بھی عرض کرتا ہوں کہ مَیں اپنی عمر کے ۶۹ ویں برس اور قمری اعتبار سے ۷۱ ویں برس میں یہ بات کہہ رہا ہوں اور میری نصف صدی قرآن کے پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے۔ میڈیکل کالج میں طالب علمی کے دَور سے ہی میرا درسِ قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دُروس کا یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا تھا اور اب ۲۰۰۰ء ہے۔ میری پوری نصف صدی اسی کام میں گزری ہے۔ گویا ؏

یہ نصف صدی کا قِصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں!

قرآن مجید سے میرا جو بھی تعلق ہے اس کی بناء پر مَیں کہہ سکتا ہوں کہ میرے نزدیک دورِ

حاضر میں قرآن کی عظمت کو کسی حد تک صرف علامہ اقبال نے سمجھا ہے۔ قرآن کی عظمت کیا ہے؟ قرآن مجید کی فی نفسہٖ عظمت کا ادراک انسانی شعور کبھی نہیں کر سکتا۔ آیئے اس بات کو سمجھنے کے لئے قرآن سے رجوع کرتے ہیں۔ سورۃ الحشر میں ارشادِ ربانی ہے :

﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

"اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ پہاڑ اللہ کے خوف سے دب جاتا' پھٹ جاتا اور ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں' تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔"

چونکہ ہم قرآن کی عظمت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں استعارہ استعمال کیا ہے۔ دراصل یہ قرآن کا اسلوب ہے کہ جہاں کوئی مفہوم اور مضمون اتنا لطیف ہو کہ ذہن انسانی اس کے ادراک سے قاصر ہو تو وہاں تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ النّور میں بھی کہا گیا ہے :

﴿ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

"اللہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے۔ اور اللہ تو ہر شے کا جاننے والا ہے۔"

اللہ کو تو ہر شے کا علم ہے جیسے کہ وہ شے فی الواقع (كَمَا هِيَ) ہے۔ حضور ﷺ کی بھی ایک دعا ہے کہ :

((اَللّٰهُمَّ اَرِنِيْ حَقِيْقَةَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ))

"اے اللہ مجھے تو اشیاء کی حقیقت دکھا جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں۔"

یعنی ظاہر تو سب کو نظر آ رہا ہے۔ حضور ﷺ دعا مانگ رہے ہیں کہ اشیاء کی معنوی حقیقت دکھا۔ گویا ہر شے کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ضروری نہیں کہ کسی شے کے ظاہر سے ہم اس شے کی اصل حقیقت کو بھی جان لیں۔ اب دیکھئے قرآن کے بارے میں جو تمثیل آئی ہے اسے بھی "اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا" کے اصول سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک تمثیل ایک واقعے کی شکل میں بھی قرآن میں آئی ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ میں تذکرہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر تورات عطا کرنے کیلئے طلب فرمایا گیا اور آپؑ مکالمہ و مخاطبۂ خداوندی سے مشرف ہوئے تو ان

کے دل میں ایک آرزو نے انگڑائی لی کہ مخاطبہ کی سعادت تو اس سے پہلے بھی حاصل ہوتی رہی ہے' کیوں نہ آج دیدار بھی ہو جائے' خواہش کا اظہار کیا : ﴿ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ﴾ بقول شاعر ؎

کیا قیامت ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

کلام تو ﴿ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ﴾ ہو رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے پروردگار! یہ حجاب ذرا اٹھا دے' تاکہ میں تجھے دیکھ لوں۔ جواب ملا ﴿ لَنْ تَرَانِیْ ﴾ "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے"۔ پھر ارشاد ہوا :

﴿ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ ﴾

"اس سامنے کے پہاڑ پر نگاہ جماؤ (ہم اپنی ایک تجلی اس پر ڈالیں گے) اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر برقرار رہ گیا تو پھر سوچنا کہ تم ہمیں دیکھ سکو گے۔ جب اللہ نے اپنی ایک تجلی اس پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ پھٹ گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور (تجلّیٔ باری تعالیٰ کے بالواسطہ مشاہدہ کا اثر یہ ہوا کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر گئے۔"

معلوم ہوا کہ جو تجلّیٔ ذاتِ باری تعالیٰ کا اثر اور تاثیر ہے وہی تاثیر تجلّیٔ صفاتِ باری تعالیٰ کی ہے۔ کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے۔ کلام میں متکلّم کی تمام شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔ ایک شخص دو جملے بولے گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کوئی اَن پڑھ' دیہاتی' گنوار اور غیر مہذّب انسان ہے۔ اسی طرح کسی اور کے دو جملوں سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بہت مہذّب اور متمدّن انسان ہے' یا بڑا عاقل اور عالم ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قرآن مجید میں منعکس ہیں' اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ حقیقت میرے علم کی حد تک علامہ اقبال کے سوا کسی اور پر منکشف نہیں ہوئی۔ چنانچہ اپنے اشعار میں فرماتے ہیں ؎

ایں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لا یزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃٌ لِلعالمیں!

ذرا اِن اشعار پر غور کیجئے۔ جیسے اقبال نے خود کہا تھا ع

"قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال عظمت قرآنی کا خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ ان کے ذہن سے نکلی ہوئی بات نہیں ہے' بلکہ یہ اُن کا عین مشاہدہ ہے۔ اس میں کسی آورد کے کہیں دُور تک آثار نہیں' آمد ہی آمد ہے۔ ان اشعار میں اقبال نے قرآن کو کتابِ زندہ قرار دیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات "الحی" ہے اسی طرح اس کا یہ کلام زندہ ہے۔ لایزال اور قدیم دو صفات صرف اللہ کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات لازوال بھی ہے اور قدیم بھی ہے۔ جس طرح اللہ کی ذات ہے ایسے ہی اللہ کا یہ کلام ہے۔ آگے اقبال کا انداز دیکھئے ؎

حرفِ او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

اقبال کے اشعار میں کس قدر تیقّن ہے! معلوم ہوتا ہے کہ انسان یقینِ کامل کے ساتھ بات کر رہا ہے۔ فرماتے ہیں اس قرآن کے حروف کے اندر تبدیلی ناممکن ہے' اس کے بارے میں شبہ ناممکن ہے' اس کے بارے میں کوئی غلط تاویل ناممکن ہے۔ عظمت قرآنی کا یہ احساس مجھے اور کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آیا' حالانکہ مَیں بہت سے علماء کی صحبت سے فیض یاب ہوا ہوں۔ مولانا مودودی مرحوم کے بھی بہت قریب رہا ہوں' مولانا اصلاحی صاحب کے بھی قریب رہا ہوں' اُن کا خادم رہا ہوں' یہ دونوں حضرات آج کے دَور کے مفسر قرآن ہیں۔ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن پوری دنیا کے اندر پھیلی ہوئی

ہے۔ شیخین (شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ) کا ترجمہ اور حواشی تو میرے لئے حرزِ جان کے درجے میں ہیں۔ لیکن مجھے قرآن کے بارے میں کہیں بھی وہ کیفیت نہیں ملی جو اقبال کے ہاں ہے۔ ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست اُو
زندہ و پائندہ و گویاست اُو

صاف ہی کہہ دوں جو میرے دل میں مضمر ہے۔ اس قرآن کو کتاب نہ سمجھنا' یہ کوئی اور ہی شے ہے۔ یہ کیا شے ہے؟ یہ اللہ کا کلام ہے۔ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے' لہٰذا جیسے اللہ کی ذات ظاہر بھی اور باطن بھی ہے' اور سورۃ الحدید کی آیت ۳ میں جس کا تذکرہ ہے کہ :

﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ﴾

"وہ اوّل بھی ہے اور آخر بھی ہے' وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے۔"

اسی طرح قرآن مجید الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی ہے۔ اور جیسے وہ "اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" ہے اسی طرح یہ بھی زندہ و پائندہ ہے ؎

زندہ و پائندہ و گویاست اُو!

پھر فرماتے ہیں ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود!
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

جب اللہ کا یہ کلام کسی انسان کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر انقلاب آ جاتا ہے۔

He is a changed person altogether from within.

یہ تبدیلی باہر سے جبراً نہیں لائی گئی' یہ اندر سے تبدیلی ہے۔ جس میں قرآن سرایت کر گیا اس کی گویا سوچ بدل گئی' نظریات بدل گئے' عقائد بدل گئے' انداز بدل گیا' تمام معیارات اور پیمانے بدل گئے۔ اور جب کسی انسان کے اندر باطنی انقلاب آتا ہے تو گویا پورے عالمی انقلاب کے لئے تمہید قائم ہو جاتی ہے۔ کم سے کم اس شخص کے لئے تو دنیا بدل جاتی

ہے' اس کے لئے اب دنیا وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ جیسے قرآن میں فرمایا گیا :

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾

یعنی قیامت کے دن زمین یہ زمین نہیں رہے گی' کچھ اور شکل میں ہو جائے گی۔ آسمان یہ آسمان نہیں رہیں گے' کوئی اور صورت ہو گی۔ اسی طرح کسی انسان کے اندر قرآن اتر جائے تو اس کے لئے یہ زمین و آسمان بدل جاتے ہیں' وہ زمین و آسمان نہیں رہتے۔ اس کی اقدار' مقاصد' اہداف اور نصب العین سب کے سب تبدیل ہو جاتے ہیں۔

علامہ اقبال کے ترجمان القرآن ہونے کے پہلو سے عرض کر رہا ہوں کہ اقبال کا فکری اثاثہ قرآن ہی ہے۔ دیکھئے خود علامہ کا دعویٰ کیا ہے ؎

گوہر دریائے قرآں سفتہ اَم
شرح رمز صبغت اللہ گفتہ اَم

دیکھو میں نے تو قرآن مجید کے دریا میں سے موتی چن لئے ہیں۔ یہ میرا کوئی کمال نہیں ہے' موتی تو قرآن کے ہیں۔ اور قرآن مجید میں آیا ہے : ﴿ صِبْغَتَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ﴾ میں نے تو صرف اس کی وضاحت کر دی ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اُن کے یہ تین شعر تو انسان پر لرزہ طاری کر دیتے ہیں جو اسرارِ خودی کے آخر میں آئے ہیں' جن میں کہ حضور سرورِ کونین ﷺ سے مخاطب ہو کر انہوں نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

اے نبیؐ ! اگر میرا دل ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں چمک ہے ہی نہیں' روشنی اور نور کا انعکاس ہے ہی نہیں اور اگر میری شاعری اور میرے پیغام میں قرآن کے سوا کوئی اور شے آ گئی ہے تو ؎

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا!

میری فکر کے ناموس کے پردے کی دھجیاں بکھیر دیجئے۔ تب تو میں اس باغ کے اندر ایک کانٹے کی مانند ہوں' اسے اٹھا کر باہر پھینک دیجئے! قیامت کے دن مجھے ذلیل و خوار کر دیجئے گا! مجھے اپنے قدم بوسی کے شرف سے محروم کر دیجئے گا اگر میں نے قرآن کے سوا کچھ کہا ہو۔

یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ لیکن ان کے اس دعوے کی صداقت کی میں گواہی دے رہا ہوں' اور میری گواہی کی بنیاد میرا قرآن سے وہ پچاس سالہ تعلق ہے جو اللہ نے مجھے عطا کیا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی تعلم و تعلیم قرآن کے اندر صرف کر کے اپنے علمِ قرآن کے چار ذرائع معین کئے ہیں۔ ایک طرف "اَبوَین" یعنی ابوالاعلیٰ اور ابوالکلام ہیں' جن سے مجھے قرآن کا حرکی' تحریکی اور انقلابی تصور ملا ہے۔ قرآن کا نظم اور اسلوب مجھے مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی سے ملا جنہیں میں "حِبین" کہتا ہوں۔ اسی طرح دو "دکترین" ہیں' ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین جن سے قرآن اور علمِ جدید کے حوالے سے مجھے رہنمائی ملی۔ اسی طرح قرآن سیکھنے کے میرے ذرائع میں میرے دو استاد "شیخین" ہیں یعنی اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہم۔ میں نے ان چار گوشوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ پھر یہ کہ سائنس کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے پس منظر میں ان تمام ذرائع سے جو کچھ لیا انہیں جمع و مرتب کیا ہے۔ تاہم میرے ان ذرائع میں اوّلین اور آخرین کی حیثیت در حقیقت علامہ اقبال کو حاصل ہے۔

اس ضمن میں یہاں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو بہت اہم ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا تذکرہ ہوا ہے' اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے' تفسیر قرآن انہوں نے لکھی ہے' صاحبِ تدبّرِ قرآن ہیں' ان کا اپنا بہت بلند مقام ہے۔ اگرچہ بعض پہلوؤں سے ہر شخص کی کسی نہ کسی بات سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے' مجھے بھی ان کی بعض چیزوں سے اختلاف ہے' لیکن بہرحال میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ایک زمانے میں ان کی آنکھوں کا آپریشن ہونا تھا جس کے لئے وہ لاہور آ گئے' لیکن آپریشن کی جو تاریخ مقرر تھی معلوم ہوا اُس دن نہیں ہو سکتا' ہفتہ دس دن انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ اپنا لکھنے کا سامان ساتھ نہیں لائے تھے اس لئے ان کے پاس فارغ وقت تھا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ اقبال کا سارا اردو فارسی کلام "الف" سے "ی" تک پڑھا۔ اس کے بعد بڑے گہرے تأثرات

انہوں نے میرے سامنے بیان کئے جو مَیں اپنی کتاب "علّامہ اقبال اور ہم" میں لکھ چکا ہوں۔ ایک تو انہوں نے کہا کہ قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے بڑا مان سا تھا کہ ان کی جو تعبیر میں نے کی ہے مجھ سے پہلے کسی اور نے نہیں کی۔ (کسی معاملے میں خاص مقام کے بارے میں شرحِ صدر حاصل ہو تو یہ گمان ہو جاتا ہے) لیکن اب میں نے اقبال کو پڑھا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان مقامات کی مجھ سے بہت بہتر تعبیر پہلے سے کر چکے ہیں۔ اقبال مفسر نہیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دَور میں فکرِ قرآن کے سب سے بڑے عالم علامہ اقبال ہیں۔ لیکن علامہ کو بھی اپنی زندگی کے آخری دَور میں قوم سے مایوسی ہوئی تھی ؎

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا مَیں موج موج دیکھ چکا صدف صدف!

واقعہ یہ ہے کہ یہ نظم بہت ہی یاس انگیز ہے۔ شاید انہوں نے مصطفیٰ کمال پاشا اور ایران کے رضا شاہ کے بارے میں کچھ توقعات قائم کر لی تھیں جو انہیں یہ کہنا پڑا ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

آخری دَور میں علامہ اقبال کو بڑے دھچکے لگے ہیں۔ امید کی جو کیفیت ان کے کلام میں ابتدائی دَور میں ہمیں نظر آتی ہے وہ آخری دَور میں نہیں تھی۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ حالات کو دیکھ کر اُن کی طبیعت پر کچھ اضمحلال طاری ہو گیا تھا۔ پہلے انہیں امید تھی کہ میرے بعد کوئی اور دانائے راز آئے گا ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز اید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید!

اسی دانائے راز کے بارے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بہت عرصے تک حیاتِ انسانی کعبہ و بُت خانوں کے اندر نالہ و فغاں کرتی ہے، تب کہیں جا کر ایک دانائے راز آتا ہے۔

اس اعتبار سے مولانا اصلاحی صاحب نے دوسری بات یہ کہی کہ علامہ کا کلام پڑھ کر میرا کلیجہ دھنس گیا کہ اقبال جیسا حُدی خوان اِس قوم میں سے ہو کر گزر گیا اور یہ قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہو گا' یعنی ہم کیا کر سکیں گے' ہم تو کچھ بھی نہیں۔ بہرحال یہ کیفیات اقبال پر بھی آئیں اور انسانی کیفیات کے اندر کبھی شرح وبسط اور کبھی قبض کی کیفیات آجاتی ہیں۔ تاہم میں تذکرہ کر رہا ہوں کہ مولانا اصلاحی صاحب کا وہ احساس کہ اقبال جیسا حدی خواں جس نے ایرانیوں کو جگا دیا اور ان کے اندر انقلابِ عظیم برپا کر دیا' مسلمانانِ ہند کو خوب غفلت سے بیدار نہ کر سکا۔ اُس وقت افغانیوں کے بارے میں علامہ اقبال نے جو کہا تھا : ؎

آسیا یک پیکرِ آب و گِل است
ملّتِ افغاں دریں پیکر دل است
از کشادِ اُو کشادِ آسیا
در فسادِ اُو فسادِ آسیا

تو آج ملّتِ افغان اقبال کے کلام سے استفادہ کر رہی ہے۔ ایران کے انقلاب کے بارے میں تو صاف کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقت میں اقبال کے کلام کا اثر ہے۔ اسی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کا دو تہائی کلام فارسی میں کیوں ہے جبکہ وہ خود ہندوستان میں رہنے والا پنجابی شخص ہے۔ یہاں شاذ ہی فارسی سمجھنے والے لوگ رہ گئے تھے' لیکن ان کا اصل کلام فارسی میں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے Seer اور Visionary تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ کیا ہونے والا ہے ؎

تہراں ہو اگر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

انہیں یہ بصارت قرآن کی بدولت ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں انہیں اِس دَور کا ترجمان القرآن کہتا ہوں۔

اقبال بحیثیت داعیٔ قرآن

اب آیئے اقبال کے داعیٔ قرآن ہونے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیجئے۔

علامہ اقبال نے امت مسلمہ کے قرآن سے اپنا تعلق منقطع کرنے پر وہ مرثیے کہے ہیں جو دراصل دردانگیز نالے ہیں ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری!

اے مسلماں! تمہارا تو اِس قرآن سے صرف اتنا تعلق ہی باقی رہ گیا ہے کہ مرتے ہوئے شخص کو سورۂ یٰسین سنا دو تاکہ جان آسانی سے نکل جائے۔ جو کتاب نسخۂ شفا اور نسخۂ حیات بن کر آئی تھی اسے تم نے جان آسانی سے نکلنے کا نسخہ بنالیا ہے۔ مزید کہتے ہیں ؎

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است
ملّت اندر خاکِ اُو آسودہ است

میں دیکھتا ہوں کہ اس فرسودہ عالم کی خاک میں اُمّتِ مسلمہ پڑی ہوئی ہے اور بڑی آسودہ ہے، مگن ہے، کوئی حال مست ہے، کوئی مال مست ہے ؎

رفت سوزِ سینہ و تاتار و کرد
یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد!

تاتاریوں کے اندر قرآن نے جو جوش پیدا کر دیا تھا، لاکھوں مسلمانوں کو قتل کرنے والے وہی تاتاری اس قرآن کی بدولت خود اسلام کے علم بردار بن گئے تھے اور وہ کرد جن کو اللہ نے قرآن کے ذریعے سے ہدایت دی تھی، صلاح الدین ایوبی انہی میں سے تھا جس نے صلیبیوں سے بیت المقدس کو واپس لیا تھا، یہ کیا ہوا کہ قرآن نے ان کے اندر جو تڑپ پیدا کر دی تھی وہ تڑپ آج کی امت مسلمہ میں کیوں پیدا نہیں ہوتی ؏

یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد!

آیا مسلمان مرگیا ہے یا معاذ اللہ قرآن مرگیا ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی مرچکا ہو تو ظاہر بات ہے کہ بڑی سے بڑی اکسیر بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کے اندر یہ تلخی اس وجہ سے ہے کہ اس امت نے قرآن کو چھوڑا ہوا ہے۔

میری زندگی کے ابتدائی واقعات سے آپ اقبال کے داعی قرآن ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا جب میرے بڑے بھائی نے مجھے

"بانگِ درا" لا کر دی تھی۔ میں جیسے تیسے اسے پڑھتا تھا اور گنگناتا تھا' کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا' کچھ لوگوں سے بھی مدد لیتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعر میرے شعور میں کہیں چپک کر رہ گیا اور اسی شعر نے میری پوری زندگی کو اس رخ پر ڈال دیا ہے کہ بحمد اللہ میری زندگی تعلّم و تعلیمِ قرآن میں گزری ہے۔ وہ شعر یہ تھا ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

ہمارے ہاں ملّت کے بڑے بڑے اکابر نے اس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں کہ اُمّت پر زوال کیوں آیا؟ کوئی کہتا ہے ہم نے سائنس چھوڑ دی' ٹیکنالوجی کی طرف نہیں گئے اس لئے یہ ہوا۔ لیکن جس طرح Pin point کر کے اقبال نے اُمّت کی زبوں حالی کی وجہ بیان کی ہے' مجھے تو کسی اور کے ہاں یہ بات نظر نہیں آتی ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

اُمّتِ مسلمہ! تو درحقیقت خوار ہوئی ہے قرآن کو چھوڑنے کے باعث' گردشِ دوراں اور گردشِ افلاک کا شکوہ خواہ مخواہ کرتے ہو۔ اے وہ قوم جو شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہے اور دشمن اور اغیار اپنے قدموں تلے تجھے روندتے ہیں' جس طرح ننگے پاؤں آکر گھاس پر سیر کر رہے ہوں' تُو اِس ذلت کو کیوں برداشت کئے ہوئے ہے' حالانکہ وہ کتابِ زندہ تیری بغل میں اب بھی موجود ہے جس نے تیرے اسلاف کو اس عالم کی نگہبانی کے رتبے سے سرفراز کر دیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی مسلم شریف کی ایک حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ))

"اللہ اس کتاب کے ذریعے بہت سی قوموں کو سربلند کرے گا اور اسی کتاب کی

بدولت (کچھ لوگوں کو) ذلیل و رسوا کرے گا۔"

یہ قرآن فیصلہ کن کلام بن کر نازل ہوا ہے ﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴾ یہ فیصلہ کن کتاب ہے جو حق بن کر نازل ہوئی ہے ﴿ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ﴾ "حق کے ساتھ ہم نے اسے اتارا ہے اور یہ حق بن کر نازل ہوا ہے۔" اب اسی کے ترازو میں قوموں کی قسمتیں تُلیں گی۔ اب اللہ تعالیٰ اس قرآن کی بدولت قوموں کو اٹھائے گا اور بامِ اوج پر پہنچائے گا اور اسی قرآن کو ترک کر دینے کے باعث انہیں ذلیل و خوار کر دے گا۔ یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے اور صحیح مسلم کی روایت ہے۔ لیکن میرے دل میں ایک الجھن سی تھی کہ آخر کیا معاملہ ہے کہ مغربی تہذیب کو عروج حاصل ہوا ہے؟ یہ قرآن کی وجہ سے تو نہیں ہے' وہ تو قرآن کے منکر ہیں' جبکہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں :

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ))

یہ نکتہ مجھ پر اُس وقت کھلا جب میں نے علامہ اقبال کے لیکچرز پڑھے۔ میں تو میڈیکل کا طالب علم تھا' یہ بڑی ثقیل کتاب تھی' ظاہر بات ہے فلسفے کی یہ کتاب میرے سمجھنے کی بات نہیں تھی' لیکن میرے لئے ایک امتحانی مرحلہ آ گیا تھا۔ ہوا یہ کہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد جو کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہیں' وہ اُس وقت ایم اے فلسفہ کر چکے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ یہ لیکچرز پڑھنے میں میری مدد کیجئے۔ میں سراسیمہ سا ہو گیا۔ چونکہ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی سے حسنِ ظن تھا اور اس کے ذہن میں میری قرآن فہمی کی کچھ چھاپ تھی' اس لئے مجھے پاپڑ بیلنے پڑے اور میں نے وہ لیکچرز پڑھے' سمجھے اور الحمدللہ سمجھائے بھی۔ وہاں یہ عقدہ کھلا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں :

"The inner core of the present western civilization is Quranic"

یعنی موجودہ مغربی تہذیب کا اندرونی ڈھانچہ (inner core) قرآن ہی سے مستعار ہے۔ تب یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جیسے کسی درخت پر آکاس بیل آ جاتی ہے لیکن آکاس بیل خود اوپر نہیں چڑھ سکتی' اسے درخت چاہئے' تہذیب حاضر کی آکاس بیل بھی حق کے درخت کی مدد سے کھڑی ہے۔ حریت و اخوت اور عدل و انصاف کا جو تصور اسلام نے قرآن کے ذریعے دیا ہے بدقسمتی سے ان قوموں نے اس کے اندر تمام حدود کو توڑ دیا۔

قرآن نے حریت کہا تھا' انہوں نے کہا مادر پدر آزادی ہونی چاہئے' حتیٰ کہ آسمانی ہدایت سے بھی خود کو آزاد کرلیا۔ قرآن میں مساوات سکھائی گئی ہے' انہوں نے مرد و عورت کو بالکل برابر قرار دے دیا جس سے خاندانی نظام بکھر کر رہ گیا۔ در حقیقت مغربی تہذیب نے ان اصولوں کو غلط رُخ پر لے جانے کا کام کیا ہے لیکن اصل درخت اور inner core وہی ہے۔

یہ بات آج سب جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے دنیا میں استخراجی منطق (deductive logic) کا دَور تھا اور اسی کا غلبہ تھا۔ لیکن استقرائی منطق (inductive logic) کا آغاز کرنے والا قرآن ہے ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یعنی کائنات کا مشاہدہ کرو اور اپنے موقف کی بنیاد علم پر رکھو۔ اس دَور کا آغاز قرآن نے کیا ہے۔ قرآن نے مظاہرِ فطرت کو اللہ کی آیات قرار دیا۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں' انہیں دیکھو' ان کو سمجھو' اللہ نے پوری کائنات مسخر کردی ہے' انہیں استعمال کرو۔ یہ سارا جذبہ در حقیقت قرآن نے پیدا کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مغرب نے اس پورے جذبے کو لے کر اس کے اوپر زہریلی آکاس بیل چڑھالی۔ بقول اقبال ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

اہلِ مغرب نے حقیقت پر جھوٹے نگ لگادیئے ہیں اور اسی سے اس کا بیڑہ غرق ہوا ہے۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اہلِ مغرب کی طرح ہم نے بھی اس قرآن کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ قرآن کہتا ہے کہ وعظ اور موعظہ حسنہ میں ہوں۔ ہم نے کہا کہ نہیں ہم تو شعر و شاعری' لطیفہ گوئی' کچھ قصّوں سے' ضعیف کہانیوں اور ضعیف روایات سے وعظ کہیں گے۔ قرآن کہتا ہے تزکیۂ نفس کا ذریعہ میں ہوں' سینوں کے روگ کا علاج میں ہوں۔ ہم نے کہا نہیں ہم تو قرآن کو صرف پڑھیں گے حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لئے' باقی اصول ہم افلاطون سے سیکھیں گے۔ تزکیۂ نفس کے طریقے ہندو سنیاسیوں سے

سیکھیں گے۔ ان سے سیکھیں گے کہ کس طریقے سے مراقبہ کیا جاتا ہے! کیا آسن بنائے جاتے ہیں' کیسے بیٹھا جاتا ہے' کیسے ضربیں لگتی ہیں۔ یہ سب ہم ان سے سیکھیں گے۔ ہماری اس حالتِ زار پر اقبال نے یہ مرثیہ کہا ہے ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ او پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو!

واعظ داستانیں بیان کرتا ہے اور اپنے ہاتھ اِدھر اُدھر پھیلا کر بات کرتا ہے۔ اس کی بات کا مفہوم تو بہت پست ہوتا ہے مگر الفاظ اور لفّاظی بہت ہوتی ہے۔ ضعیف روایات سے سارا وعظ ہو رہا ہے' لیکن قرآن کو بطورِ وعظ استعمال نہیں کیا جاتا جبکہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں :

﴿ یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾

"دیکھو لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے موعظہ اور نصیحت آ گئی ہے"۔

یعنی دلوں میں اگر سختی ہے تو دلوں میں گداز پیدا کرنے کا ذریعہ قرآن ہے' اسے استعمال کرو۔ لیکن ہم نے اسے چھوڑا اور صوفیوں نے تصوّف کے نئے سلاسل' نئے طریقے' ذکر کے نئے انداز اور مراقبے ایجاد کر لئے۔ چنانچہ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوّال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

صوفی اپنا اونی لباس (جُبّہ یا قبا) پہن کر بیٹھا ہوتا ہے اور قوّالی سے اس کے دل کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اسی سے اس کو حال آتا ہے۔ عراقی اور حافظ کا کوئی شعر ہو تو اس سے اس کے دل کے اندر آگ لگ جاتی ہے اور اس کے جذبات ابلنے لگتے

ہیں، لیکن اس کی محفل میں قرآن کا گزر ہی نہیں ہے، قرآن کے ساتھ اس کی کوئی سازگاری ہی نہیں ہے۔

علامہ اقبال نے یہ مرثیے کہے ہیں اور پھر قرآن کی طرف پکارا ہے ؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات!
از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ

اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کے بارے میں ابھی ہم نے اس حدیثِ نبویؐ کا مطالعہ کیا ہے :

((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ))

اس کے ضمن میں دو چیزیں ذہن میں رکھئے۔ کسی بھی قوم کے اندر نشأۃِ ثانیہ کا پہلا مرحلہ افراد کو بدلنا ہے۔ یہ کام حضور ﷺ نے قرآن کے ذریعے سے کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہجِ عمل کے عناصرِ چہارگانہ قرآن حکیم میں چار مقامات پر بیان ہوئے ہیں : ۱۔ تلاوتِ آیات ۲۔ تزکیہ ۳۔ تعلیمِ کتاب ۴۔ تعلیمِ حکمت۔ اس ضمن میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں :

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ﴾

"یقیناً اہلِ ایمان پر اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اُس کی آیات اُنہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

اور رسول اللہ ﷺ کے اساسی منہجِ عمل کے یہ چاروں عناصر قرآن ہی پر مبنی تھے۔ ظاہر

بات ہے اگر افراد کو بدلنا ہے تو پہلے قرآن کو ان کے اندر اتارنا پڑے گا ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود!

ان کے ذہنوں میں اور ان کے قلوب پر قرآن کو اتارو ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف!

جب قرآن دلوں پر اثر کرے گا تو پھر اسی سے سوچ بدلے گی' افکار و نظریات بدلیں گے اور مقاصد و اقدار میں تبدیلی آئے گی۔ چنانچہ پھر تبدیل شدہ افکار و نظریات کو جمع کر کے ان کا کوڑا بناؤ اور باطل کے سر پر دے مارو۔ اس کے بارے میں دو شعر اقبال نے نجانے کس کیفیت میں کہے تھے۔ غالباً ان کے اوپر بھی ایسے لمحات گزرتے ہوں گے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے ((لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ)) "میرا اللہ کے ساتھ خاص وقت بھی ہوتا ہے"۔ ہم کیا سمجھیں کہ وہ "خاص وقت" کیا ہوتا ہے' ہماری سمجھ سے تو وہ بالاتر ہے۔ جیسے حضور ﷺ فرماتے ہیں "میں اگر صومِ وصال رکھتا ہوں تو میں تو اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں' وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے"۔ تمہیں تو روزہ رکھ کر شام کو افطار کرنا ہوتا ہے' تم صومِ وصال نہیں رکھ سکتے کہ دو تین دن کا مسلسل روزہ رات کو بھی جاری ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا "حضورؐ آپ بھی تو رکھتے ہیں"۔ فرمایا : ((اَیُّکُمْ مِثْلِیْ)) "تم میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہو؟" ((اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ)) "میں تو اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں' وہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔" اسی طرح کی کیفیات علامہ کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اب یہ مکالمہ دیکھئے ؎

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن!

اللہ نے مجھ سے کہا اے اقبال! ہم نے تمہیں جس دنیا میں بھیجا ہے کیا وہ تمہیں اچھی لگی؟ کیا تمہارے لئے یہ سازگار اور خوشگوار ہے؟ میں نے کہا نہیں نہیں' مجھے یہ پسند نہیں ہے' کیونکہ یہاں پر ظلم و جور ہے' استحصال ہے' گندگیاں ہیں' مجھے پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ پھر اسے توڑ پھوڑ دو' ختم کر دو! تو یہ ہے انقلاب۔ کسی رائج الوقت نظام کو توڑ

پھوڑ کر اس کی جگہ ایک نیا نظام لانا ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا یہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ!

یہ آسان کام نہیں ہوتا' اس کے لئے بڑی محنت اور جِدّ و جُہد کرنا پڑتی ہے' قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں نے قربانیاں دیں اور کئی سو صحابہ رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش کیا تب وہ انقلاب آیا۔ لیکن دیکھئے اقبال کے ایک شعر میں انقلاب کا پورا فلسفہ موجود ہے ؎

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن!

لیکن برہم زن کیسے کریں؟ فرمایا ؏

با نشّۂ درویشی در ساز و دمادم زن!

پہلا مرحلہ درویشی فقر اور دعوت و تبلیغ کا ہے۔ درویشانہ انداز میں خوشامد بھی کرو' گھر گھر جا کر دستک بھی دو' وہ تمہیں پاگل کہیں' مجنون' شاعر' مسحور اور ساحر کہیں' سب برداشت کرو۔ رسول اللہ ﷺ کو کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے :﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ "اے نبی! ہمیں خوب معلوم ہے جو کچھ یہ آپ کے بارے میں کہتے ہیں اُس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے"۔ لیکن اے نبی ﷺ ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴾ "صبر کیجئے اس پر جو یہ کہہ رہے ہیں اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جایئے"۔ بارہ برس تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل آخر کیا تھا؟ بدھ مت کے بھکشوؤں کی مانند ہی تو تھا کہ کوئی مار گیا ہے تو ٹھیک ہے' کوئی جوابی کارروائی نہیں' کوئی گالی دے گیا ہے تو کوئی جواب نہیں۔ حکم یہ تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو' کیونکہ ابھی تمہیں وقت چاہئے تاکہ تمہاری ایک مضبوط جماعت بنے۔ اس جماعت کی تربیت اور تنظیم ہو۔ مکّے کے بارہ برس اسی میں گزرے ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

لیکن جب تیار ہو جاؤ' مضبوط اور پختہ ہو جاؤ تو سلطنت جم سے ٹکرا جاؤ! کسی نے اردو میں کیا خوب کہا ہے ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹّی کا اک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو!

میں اسے سادہ مثال سے سمجھایا کرتا ہوں۔ اگر کہیں گیلی ریت ہو جیسے ساحل پر ہوتی ہے' اس کا گولا بنا کر شیشے پر دے ماریں گے تو شیشہ قائم رہے گا وہ ریت بکھر جائے گی' البتہ اس کو ذرا آگ میں تپا کر کے روڑا بنا کر ماریں تو کوئی نتیجہ برآمد ہو گا۔ یہی بات علامہ اقبال کے مرشدِ معنوی اکبر الٰہ آبادی نے کہی تھی۔ اقبال نے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کے انتقال پر ان کے بیٹے کے نام تعزیتی خط لکھا تھا تو کہا تھا کہ میں آپ کے والد مرحوم کو اپنا مرشد معنوی سمجھتا ہوں۔ ان کا یہ شعر ہے ؎

تُو آگ میں جل اور خاک میں مل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

صحابہ کرام ؓ بارہ برس تک آگ کی بھٹیوں میں سے گزرتے اور سختیاں جھیلتے رہے تھے۔ وہ مصیبتیں برداشت کر رہے تھے لیکن انہیں جوابی کارروائی تک کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کوئی خانقاہی نظام نہیں تھا' بلکہ ع

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

جیسے کہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے : ﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ ﴾ "ہم حق کا کوڑا باطل کے سر پر دے مارتے ہیں جو اس کا بھیجا نکال دیتا ہے"۔ لیکن پہلے وہ کوڑا بنانا پڑتا ہے' افراد تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ تیرہ برس کی محنت کا حاصل وہ ۳۱۳ صحابہؓ تھے جو غزوۂ بدر میں جان ہتھیلی پر لے کر نکل آئے تھے۔ وہ کسی جذباتی تقریر کے نتیجے میں جمع ہونے والے نہیں تھے' یہ ۳۱۳ وہ تھے جو آگ کی بھٹیوں میں سے گزر کر آئے تھے۔ وہ زر خالص بن چکے تھے۔ ان کے اندر یہ آگ لگی ہوئی تھی کہ ہماری جان تو بس ہے ہی اس لئے کہ ہمیں تو بس شہادت چاہئے۔ انہیں اپنی زندگی سے بڑھ کر موت عزیز تھی۔

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

جب تک یہ کیفیت نہ ہو انقلاب نہیں آتا۔

تحریک پاکستان اور علّامہ اقبال

بدقسمتی سے کراچی سے اب یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ علامہ اقبال کا تحریک پاکستان میں کوئی عمل دخل نہیں۔ ویسے تو وہاں کا خاص مکتبِ فکر علامہ اقبال کو بہت پہلے سے disown کر چکا ہے۔ سندھی نیشنلسٹ طبقے کے بھی یہی خیالات ہیں کیونکہ علامہ پنجابی تھے۔ اس کے علاوہ وہاں مہاجرین کی ایک لسانی تحریک ابھری ہے جو یہ کہتی ہے کہ اقبال پنجابی تھا اور پنجابی تو "ڈھگے" ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ پنجابیوں کو تو disown کر چکے تھے۔ اب وہ اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان کو بھی disown کر رہے ہیں' دو قومی نظریئے کو بہت بڑی غلطی قرار دے رہے ہیں اور پاکستان بنانے کو بہت بڑی غلطی تصور کر رہے ہیں۔ جو لوگ یہاں تک پہنچ گئے ہوں وہ اگر یہ کہیں کہ قیامِ پاکستان میں اقبال کا کوئی رول نہیں ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں بلکہ بہت چھوٹی سی بات ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ صد فیصد درست ہے۔ پاکستان کی تو قرارداد بھی اقبال کے انتقال کے پونے دو سال بعد ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی تھی۔ علامہ کا تو ۱۹۳۸ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے تحریک مسلم لیگ تو تھی لیکن تحریک پاکستان اس کے بعد شروع ہوئی۔ ظاہر بات ہے اس میں بالفعل علامہ اقبال کا کوئی حصّہ نہیں۔ لیکن اصل میں یہ سمجھئے کہ علامہ اقبال کا تحریکِ پاکستان میں حصّہ بعینہٖ وہ ہے جو اقبال سے تین سو سال قبل مجدّد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ اُس وقت بھی اسلام کے خلاف سب سے بڑا اقدام یہی ہوا تھا کہ محمد ﷺ کا دین اب ختم ہو گیا' کیونکہ اسے ایک ہزار برس پورے ہو گئے' لہٰذا دین الٰہی اور دین اکبری شروع کیا گیا۔ اللہ کا تو ایک دن ہزار برس کا ہوتا ہے۔ قرآن میں سورۃ الحج میں ارشادِ خداوندی ہے ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ دینِ الٰہی یا دین اکبری آخر یہی تو ہے کہ نبوّت سے تعلق منقطع کر لو۔ اللہ کو تو کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی نام سے ماننا ہی ہے' چنانچہ اب یہ دین الٰہی ہو گا۔ اس میں درحقیقت نبوّت کی نفی ہو رہی تھی' اس لئے کہ شریعت کا سارے کا سارا دارومدار سُنّت پر ہے۔ اور اگر قرآن

مجید کو سنّت سے کاٹ دیا جائے تو پھر جو چاہے اس کی تاویل کرلی جائے' وہ تو پھر موم کی ناک ہے چاہے اُدھر لے جائیں اور چاہے اِدھر۔ سنّت اسے باندھتی ہے' اسے ایک عملی شکل دیتی ہے اور اس کی مکمل صورت گری کرتی ہے۔ یہ فتنہ اس قدر زبردست تھا کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اُس وقت ہندوستان میں مسلمان سیاسی اعتبار سے اپنے عظیم ترین دَور میں تھا۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی بڑی عظمت تھی۔ جلال الدین اکبر کو اکبرِ اعظم اور مغل اعظم (The Great Mughal) کہا جاتا تھا' لیکن اسلام کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اس کی جگہ دینِ اکبری یا دینِ الٰہی ایجاد کیا جارہا تھا۔ اُس وقت اللہ نے ایک مردِ رویش کو اٹھایا' جس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

حاضر ہوا مَیں شیخِ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

انہوں نے سب سے زیادہ زور سنّت پر دیا۔

دینِ اکبری کے فتنے کی طرح دو سو سال بعد برہمو سماج کے نام سے ایک اور فتنہ راجہ موہن رائے نے اٹھایا کہ صرف خدا کو مانو' باقی یہ سنّتیں یا شریعتیں وغیرہ جو ہیں یہ تو تفرقہ کی بنیاد ہیں۔ رام اور رحمٰن سے آخر کیا فرق پڑتا ہے' چاہے رام کو پکارو چاہے رحمٰن کو ایک ہی بات ہے۔ ع "مسجد مندر ہکڑو نور"۔ مسجد میں بھی مندر میں بھی ایک ہی نور ہے۔ اُمّتِ اسلامیہ کا تشخص اُس وقت جس طرح مجدّد الفِ ثانی نے برقرار رکھا اسی طرح وہی تشخص علامہ اقبال نے اس صدی میں برقرار رکھا ہے۔ یہ اتنا زبردست فتنہ تھا کہ گاندھی بھی اسی کا پرچارک بن گیا تھا۔ وحدتِ ادیان کا فلسفہ اسی کے حوالے سے گھڑا گیا تھا۔ اگر اُس وقت ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ اکبر کو مل گئے تھے تو یہاں ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ شخصیت ان کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئی تھی۔ اپنی پرارتھنا میں کچھ قرآن

پڑھالیا' کچھ گیتا پڑھالی' کچھ وہ پڑھ دیا اور کچھ یہ' اور کہا گیا کہ یہ ایک ہی بات ہے' نماز وغیرہ سے کیا ہوتا ہے' اصل میں تو اللہ "ایشور" ہے۔ اس فتنے کا مقابلہ کرنے والا سوائے اقبال کے اور کوئی نہیں ہے۔

دوسری طرف جمعیت علماء اسلام جیسی عظیم قوت تھی۔ وہ اگرچہ وحدت ادیان وغیرہ کے قائل نہیں تھے لیکن ایک متحدہ قومیت کے حوالے سے وہ بھی ان کے ہم کلام اور ہم نوا بن گئے تھے۔ اُس وقت مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کی حفاظت صرف اقبال کر سکتا تھا۔ کسی اور شخصیت کی حیثیت ہی یہ نہیں تھی' نہ کسی کا یہ فکری مقام تھا اور نہ علمی مقام' اور نہ کسی کو وہ مقبولیت ہی حاصل تھی۔ اس کے بعد اقبال سے ہی یہ چیز لے کر مولانا مودودیؒ نے اس میدان میں بہت وقیع خدمات سرانجام دیں اور "مسئلہ قومیت" اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" (اوّل و دوم) جیسی کتابیں تصنیف فرمائیں جنہیں اُس زمانے میں مسلم لیگیوں نے اپنے حق میں خوب استعمال کیا۔ بعد میں پھر ان کا راستہ الگ ہو گیا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر علامہ اقبال نہ ہوتے تو برعظیم پاک و ہند میں اس امت کا جداگانہ تشخص ہی ختم ہو جاتا۔ میں انہیں حضرت مجدد کا بروز سمجھتا ہوں۔ اگرچہ بروز کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے' لیکن یہ کہ جس قدر گہری مناسبت انہیں حضرت مجدد کے ساتھ ہے اس کے پیش نظر یہ لفظ استعمال کرتا ہوں۔ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سنّت کی اہمیت پر جس قدر زور دیا اسی انداز سے اقبال نے بھی اس کو واضح کیا۔ اقبال کا وہ شعر بھی یاد رکھئے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یعنی اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں میں پہنچاؤ' اس لئے کہ دین تو نام ہی مصطفیٰ ﷺ کا ہے۔ اگر وہاں تک نہ پہنچو گے تو پھر تمام بولہبی ہے۔ چاہے تم نے کتنے ہی مذہبی نقاب اوڑھے ہوئے ہوں اور چاہے تمہارا لبادہ کتنا مذہبی ہو لیکن اگر یہ بات سامنے نہیں ہے اور اس سے ہٹ کر اگر کوئی راستہ اختیار کرو گے تو پھر دین سے تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

علامہ اقبال کی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل

اب آخری بات عرض کر رہا ہوں' ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو یہ تعلّی محسوس ہو۔ دیکھئے علامہ کی زندگی کے آخری دو تین سال کے دوران ان کی جن خواہشات کا ہمیں سراغ ملتا ہے بدقسمتی سے وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اس کے لئے وہ گویا منتظر رہے کہ کوئی اور آئے اور یہ کام کرے۔ ان کی ایک خواہش یہ تھی کہ ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو گریجویٹس کو قرآن پڑھائے۔ چودھری نیاز علی خان ان کے عقیدت مند تھے۔ وہ محکمہ نہر میں انجینئر تھے اور بڑے افسر تھے۔ اس کے ساتھ بہت بڑے زمیندار بھی تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ علامہ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں دین کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ علامہ نے فرمایا کہ دیہات کے اندر ایک ایسا ادارہ بناؤ کہ جہاں گریجویٹس کو لا کر رکھا جائے اور انہیں قرآن پڑھایا جائے۔ اب جدید تعلیم کے ساتھ الحاد بھی آگیا ہے تو اس کو اگر کسی طریقے سے ختم کیا جا سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ گریجویٹس کو قرآن پڑھایا جائے۔ بہرحال انہوں نے پٹھان کوٹ میں "دارالاسلام" کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ جامعہ الازہر کے ریکٹر کو علامہ اقبال نے خط لکھا کہ ہمیں ایک ایسا روشن خیال عالمِ دین دیجئے جو ہمارے گریجویٹس کو انگریزی میں قرآن پڑھا سکے اور مطمئن کر سکے۔ وہاں سے معذرت آگئی کہ ہمارے پاس کوئی ایسا عالم نہیں۔ لہٰذا یہ سکیم تو وہیں رہ گئی' اگرچہ دو عمارتیں بن گئی تھیں۔ مولانا مودودی علامہ کی دعوت پر جس وقت پنجاب منتقل ہوئے تو ان کا مرکز وہیں بنا' اگرچہ ایک سال بعد ہی چوہدری نیاز علی خان سے اُن کی اَن بن ہو گئی تو وہ لاہور آگئے اور لاہور میں انہوں نے جماعت اسلامی قائم کی۔ چوہدری صاحب جب دوبارہ انہیں لے گئے تو جماعت کا مرکز تو قائم رہا لیکن گریجویٹس کو قرآن پڑھانے کے لئے ادارہ قائم نہ ہو سکا۔

میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اقبال کے ایک ادنیٰ خوشہ چیں' عقیدت مند اور فرزند معنوی کی حیثیت سے میرے ہاتھوں اللہ کے فضل سے قرآن اکیڈمی بنی اور اب یہاں سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں گریجویٹس بلکہ پوسٹ گریجویٹس Msc,MA ڈاکٹر' انجینئر یہاں تک کہ Ph.D حضرات عربی سیکھتے اور قرآن پڑھتے ہیں۔ امریکہ سے

لوگ آکر ہمارے ساتھ قیام کرتے ہیں اور الحمدللہ قرآن پر مطمئن ہو کر جاتے ہیں۔ ان کی عظیم اکثریت اب اسی کام کو لے کر چل رہی ہے اور ان کا ماٹو یہی ہے کہ ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَہٗ)) "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں"۔ میرے ایک شاگرد ڈاکٹر طاہر خان خاکوانی کو نیویارک میں تبلیغی جماعت کے مرکز کی طرف سے دورۂ ترجمۂ قرآن کروانے کی دعوت آئی ہے۔ ان کے علاوہ میرا اپنا بیٹا حافظ عاکف سعید دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کرنے شکاگو جا رہا ہے۔ (۱) بہرحال جس کی خواہش لئے علامہ اقبال دنیا سے چلے گئے وہ ادارہ اللہ کے فضل و احسان سے میرے ہاتھوں قائم ہوا۔

آپ حضرات کی خدمت میں ایک کتابچہ "علّامہ اقبال کی آخری خواہش" پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اُس خط و کتابت پر مشتمل ہے جو ۳۲ء سے لے کر ۳۵، ۳۶ء کے چار سالوں میں ڈاکٹر ظفر الحسن کی علامہ اقبال سے ہوئی ہے۔ اسے آپ پڑھئے۔ علامہ اگرچہ مسلم لیگ کے خادم، رہنما اور اس کے کارکن بھی تھے، وہ قائداعظم کے ساتھی بھی تھے۔ ان کے بارے میں قائداعظم کے الفاظ یہ تھے :

He stood like a rock by my side

"اقبال چٹان کے مانند میرے ساتھ کھڑے رہے"۔

علامہ اقبال کو انہوں نے یہ کہا :

"He is the main source of my inspiration"

"مجھ کو جو جذبہ ملا ہے اس کا سرچشمہ اقبال ہے"۔

اس کے باوجود اقبال یہ سمجھ گئے تھے کہ اس قومی تحریک سے قومی ریاست تو وجود میں آجائے گی لیکن اسلامی ریاست وجود میں نہیں آسکتی۔ مسلم لیگ سے مولانا مودودی کا Point of departure بھی یہی تھا اور انہوں نے ۴۱ء میں جماعت اسلامی اسی لئے بنائی، حالانکہ اس سے پہلے ان کی کتابیں مسلم لیگ استعمال کر رہی تھی اور وہ مسئلہ قومیت

---

(۱) واضح رہے کہ یہ خطاب رمضان المبارک سے قبل ہوا تھا۔ الحمدللہ امریکہ میں دورۂ ترجمہ قرآن کے متذکرہ بالا دونوں پروگرام کامیابی سے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ خود محترم ڈاکٹر صاحب نے بھی نیویارک میں انگریزی زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی سعادت حاصل کی۔

پر بہت بڑی اتھارٹی ہیں۔ علامہ اقبال کا خیال بھی یہی تھا کہ اس طرح کی قومی تحریک سے محض ایک قومی ریاست تو وجود میں آجائے گی جبکہ اسلامی ریاست تو تب ہی وجود میں آسکتی ہے جب کہ اس کے لئے کوشش کرنے والے لوگ خود اسلام پر کاربند ہوں' اپنی ذات اور گھر میں اسلام کو نافذ کریں اور پھر کسی ایک شخص سے بیعت کر کے بنیانِ مرصوص بنیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے جمعیت شُبّان المُسلمین قائم کرنے کا ارادہ کیا اور اس جمعیت کا دستور بھی بنا۔ میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا بہت احسان مند ہوں کہ وہ اپنی وفات سے کچھ ہی دن قبل ہمیں یہ کتابچہ دے گئے' ورنہ ہمیں اس کے متعلق کیا پتہ تھا۔ جس کے سامنے بھی یہ بات آتی ہے اس کے لئے یہ ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ جمعیت شُبّان المسلمین بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی تھی' جمہوریت کی بنیاد پر نہیں' اور اس کی تنظیم امارت کی بنیاد پر قائم ہونی تھی۔ اس میں طے تھا کہ ہم الیکشن میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ بعینہٖ انہی اصولوں پر ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی' جبکہ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ علامہ اقبال کے ذہن میں کیا نقشہ تھا' لیکن آج میں کہہ سکتا ہوں کہ بعینہٖ وہی نقشہ علامہ اقبال کے ذہن میں تھا۔ گویا ع

متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!

میری رائے علامہ اقبال کی رائے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہوئی ہے اور ہماری تنظیم بیعت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ اس میں امیر کو شوریٰ پر ویٹو کا حق حاصل ہے۔ یہی باتیں اقبال نے بھی کی تھیں۔ ڈاکٹر ظفر الحسن کی رائے بھی یہی تھی جو علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلاسفی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ رہے ہیں۔

مولانا مودودی مرحوم کانوائے وقت میں ایک مضمون شائع ہوا تھا' جس کے آخری الفاظ بڑے عجیب تھے کہ "حضرت علامہ کے سینے میں جو اصل آرزو ہے اسے تو کوئی جانتا ہی نہیں۔" میں سمجھتا ہوں کہ اسی آرزو کی تکمیل کے لئے مولانا مودودی نے جماعت اسلامی بنائی' لیکن اس میں دو چیزوں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ایک تو یہ کہ وہ بیعت کی بنیاد پر نہیں بنائی۔ دوسرے یہ کہ وہ اس راستے سے بھی ہٹ گئی اور الیکشن کا راستہ اختیار کر کے ایک سیاسی جماعت بن گئی۔ لیکن میں نے تنظیم اسلامی بعینہٖ اُسی نقشے پر قائم کی جو علامہ

اقبال نے ۱۹۳۵ء کے اندر سوچ کر بنایا تھا۔

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے راستے سے انقلاب لایا جائے' لیکن یہ انقلاب انفرادی ہو گا۔ اجتماعی انقلاب کے لئے جماعت ناگزیر ہے اور جماعت بھی وہ کہ جس کا نقشہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۵ء میں دیا تھا' اگرچہ اس نقشے پر کوئی تعمیر نہیں ہو سکی تھی' لیکن اس پر تعمیر کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کے ایک فرزندِ معنوی کو اور ان سے ایک ادنیٰ سی نسبت رکھنے والے کو عطا فرمائی۔ فالحمدللّٰہ علٰی ذٰلک!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

بقیہ : رسولِ کامل ﷺ

﴿ ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ۝ ﴾

"وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے' تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے آخری بات فرمائی کہ مسلمانو! میرا کام ابھی مکمل نہیں ہوا ـــــ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے!
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!!

پورے عالمِ انسانیت تک اس پیغام کو پہنچانا اب تمہارے ذمے ہے۔

((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))

"اب چاہیئے کہ پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں اُن کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

فَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا

توحید پر ایمان اور شرک سے بیزاری

ملّتِ ابراہیمی کا امتیازی شعار

آیاتِ قرآنیہ اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں

انتخاب و ترتیب: حافظ محمد سلیمان

۱۔ ہم بحمداللہ مسلمان ہیں اور ہمارا تعلق ملت ابراہیمیؑ سے ہے۔ ہمارے رسول اکرم ﷺ کو بھی ملت ابراہیمیؑ کا اتباع کرنے کے لئے وحی کی گئی اور یہ ارشاد فرمایا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہ تھے۔

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۝﴾ (الحج : ۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام ''مسلم'' رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ۔ تو بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا وہ مددگار ہے۔''

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝﴾ (النحل: ۱۲۳)

''پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یک سو ہو کر ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقے پر چلو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

۲۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے اور جلیل الشان پیغمبر حضرت یعقوب علیہ السلام کو دم آخر ایک ہی بات کی فکر تھی کہ ان کی اولاد اُن کے بعد کس کی عبادت کرے گی! جدائی کی اس گھڑی میں آپ کی آخری خواہش یہی تھی کہ ان کی اولاد توحید کے صراطِ مستقیم پر ہی گامزن رہے اور شرک کی آلودگی سے بچتی رہے۔

﴿وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهِیْمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝﴾ (البقرۃ: ۱۳۲، ۱۳۳)

''اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی کہ: میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔ پھر کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا! اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا: بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ ان سب نے جواب دیا: ہم اسی ایک اللہ کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم اور اسحٰق (علیہما السلام) نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔''

۳۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عظیم المرتبت پڑپوتے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید میں بھی ایک ہی سبق یاد رہا اور وہ سبق توحید پر ایمان اور شرک سے بے زاری کا تھا اور یہی سبق آپؑ نے اپنے ساتھی قیدیوں کو بھی نہایت ہی خوش اسلوبی سے پڑھایا۔

﴿قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف:۳۷ ـ ۴۰)

''(یوسف نے) کہا: یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء واجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کیلئے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اُس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

۴۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خانۂ کعبہ کی (تعمیر کے لئے) جگہ تجویز کرتے ہوئے شرک کی آلودگی سے بچتے رہنے کی بھی ہدایت فرمائی اور (دیگر ہدایات کے علاوہ) پوری دنیا کے لوگوں کو حج کے لئے بلاوا دینے کا حکم دیا۔ ہمارے رسول اکرم ﷺ کی سنتِ عالی ہے کہ جو حج کرنے آئے وہ کلماتِ لبیک پڑھتے ہوئے آئے اور جب حج ختم کر کے واپس جائے تو پھر کلمات پڑھے۔ دونوں صورتوں میں کلمات کا مفہوم توحید کے آوازے کو بلند کرنا اور شرک

سے بیزاری کا اظہار ہے۔

﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝﴾ (الحج: ٢٦، ٢٧)

''یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع کرنے والوں کے لئے پاک رکھو اور لوگوں کو حج کے لئے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں، تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کیلئے رکھے گئے ہیں۔''

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ تَلْبِيَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ)) قَالَ وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا يَزِيْدُ فِيْهَا لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ بِيَدِكَ لَبَّيْكَ وَالرَّغْبَآءُ اِلَيْكَ وَالْعَمَلُ))

(صحيح مسلم: كتاب الحج، باب التلبية وصفتها و وقتها)

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ لبیک پکارنا رسول اللہ ﷺ کا یہ تھا: ((لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ)) (یعنی حاضر ہوں تیری خدمت میں، یا اللہ حاضر ہوں تیری خدمت میں۔ حاضر ہوں میں، تیرا کوئی شریک نہیں۔ حاضر ہوں میں، بے شک سب تعریف اور نعمت تیرے لئے ہے اور ملک تیرا ہی ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔) اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان میں یہ کلمات زیادہ پڑھتے تھے: لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ بِيَدِكَ لَبَّيْكَ

وَالرَّغْبَآءُ اِلَیْکَ وَالْعَمَلُ (یعنی میں حاضر ہوں تیری خدمت میں اور میں حاضر ہوں تیری خدمت میں اور سعادت سب تیری ہی طرف سے ہے اور خیر تیرے ہی دونوں ہاتھوں میں ہے۔ حاضر ہوں میں تیرے آگے اور رغبت کرتا ہوں میں تیری ہی طرف اور عمل تیرے ہی لئے ہے)۔''

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِیَ اللّٰه عنه قَالَ : کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَفَلَ مِنَ الْجُیُوْشِ اَوِ السَّرَایَا اَوِ الْحَجِّ اَوِ الْعُمْرَةِ اِذَا اَوْفٰی عَلٰی ثَنِیَّةٍ اَوْ فَدْفَدٍ کَبَّرَ ثَلَاثًا ' ثُمَّ قَالَ : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ لَهُ الْ مُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ' آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ 'صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ 'وَنَصَرَ عَبْدَهٗ 'وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ))

(صحیح مسلم' کتاب الحج، باب مایقال اذا رجع من سفر الحج وغیرہ)

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب لوٹتے لشکروں سے یا لشکر کی چھوٹی جماعت سے یا حج وعمرہ سے تو جب پہنچ جاتے کسی ٹیلہ پر یا اونچی زمین کنکریلی پر تو تین بار ''اللہ اکبر'' کہتے۔ پھر پڑھتے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ' وَنَصَرَ عَبْدَهٗ' وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ (یعنی کوئی لائق عبادت کے نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی شریک نہیں اس کا، اسی کی ہے سلطنت اور اسی کے لئے ہے سب تعریف اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ ہم لوٹنے والے، رجوع کرنے والے، عبادت کرنے والے، سجدہ کرنے والے، اپنے رب کی خاص حمد کرنے والے ہیں۔ سچا کیا اللہ پاک نے وعدہ اپنا اور مدد کی اپنے غلام کی اور شکست دی لشکروں کو اسی اکیلے نے)۔''

☆☆☆

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مُدّعا اور طریق کار

ہمارے تحقیق اسلامی کے اداروں کے سامنے کرنے کا اصل کام

تحریر: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

اسلامی تحقیق کے معنی

اِس وقت ملک میں اسلامی تحقیق کے کئی ادارے کام کر رہے ہیں، جن میں بعض حکومت کی سرپرستی میں ہیں اور بعض پرائیویٹ۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں اسلامی تحقیق کا مفہوم واضح نہیں۔ اسلام، جیسا کہ اسے حضور سرور کائنات ﷺ ہمارے پاس لائے ہیں، ان مقدس تعلیمات کا نام ہے جو قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اسلامی تحقیق کی تعریف اس طرح سے کرنی چاہئے کہ اسلامی تحقیق وہ تحقیق ہے جس کا موضوع ہماری ان مقدس کتابوں کے مشتملات ہوں اور جس کا مقصد یہ ہو کہ ان مشتملات کو لوگوں کے لئے زیادہ قابل فہم بنایا جائے۔

اس تعریف کی روشنی میں ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی تحقیق میں کونسی چیزیں شامل ہیں اور کونسی شامل نہیں۔ مثلاً اس میں وہ سب تحریں شامل ہوں گی جو مسلمان علماء (ا) ان مقدس کتابوں کے متعلق (ب) ان کتابوں کے متعلق جو ان مقدس کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہوں، ماضی میں لکھ چکے ہیں یا آئندہ لکھیں گے۔ پھر چونکہ یہودی یا عیسائی مستشرقین نعمت ایمان سے بے نصیب ہونے کی وجہ سے ہماری مقدس کتابوں کو مقدس کتابوں کی حیثیت سے نہیں سمجھ سکتے، اور ان سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کو مقدس کتابوں کے مقدس مشتملات کی حیثیت سے دوسروں کے اذہان کے قریب لانے کی کوشش کر سکتے ہیں، یا ایسا کرنے کی نیت ہی رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسلامی تحقیق سے وہ تمام تحریریں خارج سمجھی جائیں گی جو یہودی اور عیسائی مستشرقین

ہماری کتابوں کے متعلق یا ان کتابوں کے متعلق جو ہماری مقدس کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہوں، ماضی میں لکھ چکے ہیں یا آئندہ لکھیں گے۔

میکانیکی اور اصلی اسلامی تحقیقات

اسلامی تحقیق کی دو قسمیں ہیں، یا تو یہ میکانکی ہوتی ہے یا اصلی۔ مثلاً مقدس کتابوں یا مقدس کتابوں پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے کسی کتاب کی کوئی لغات یا کوئی اشاریہ تیار کرنا، یا اس کے مشتملات کا ترجمہ کرنا، یا ان کو نئی ترتیب دینا، یا ان کا اختصار لکھنا، یا کسی ایسے تاریخی قسم کے یا کسی اور نوعیت کے مواد کا، جو ان کے مضمون سے تعلق رکھتا ہو، اس غرض سے جمع کرنا کہ اس کے حوالے آسانی سے میسر آجائیں، میکانکی اسلامی تحقیق ہے۔ جبکہ مقدس کتابوں کے مضمون کی علمی تشریح یا تفسیر یا توسیع کرنا اصلی اسلامی تحقیق ہے۔ اصلی اسلامی تحقیق میکانکی اسلامی تحقیق سے بدرجہا زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق اسلام کے معنی یا اس کی روح سے ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو درحقیقت اسلامی تحقیق سے ایسی ہی تحقیق مراد ہے۔

اس قسم کی اسلامی تحقیق کے لئے تعلیماتِ اسلام کی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور اسلام کی ایسی بصیرت صرف اس عالم دین کا حصہ ہو سکتی ہے جو اسلام پر ایسا خالص اور پختہ ایمان رکھتا ہو کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کی شدید محبت کی صورت اختیار کر لے، اور جو اسلام کے مذہبی اور اخلاقی ضبط اور نظم کو دل و جان سے قبول کر چکا ہو اور اس پر متواتر عمل پیرا ہو۔ پھر یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی عالم دین مقدس کتابوں کے بار بار کے مطالعہ سے ان کی روح میں نہ گھس جائے اور رسول اللہ ﷺ کی دلی اطاعت سے انسان اور کائنات کا وہی نظریہ پیدا نہ کر لے جو خدا نے آپؐ کی معرفت ہم تک پہنچایا ہے۔ چونکہ اس قسم کی اسلامی تحقیق صرف خدا اور رسول ﷺ اور اسلام کی شدید محبت کے سرچشمہ سے ہی پھوٹ سکتی ہے لہٰذا وہ دوسروں میں بھی اسلام کی محبت پیدا کرتی ہے۔ اس قسم کی اسلامی تحقیق کی مثال شاہ ولی اللہؒ، غزالیؒ، رومیؒ، محی الدین ابن العربیؒ، ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور اقبالؒ ایسے حکمائے دین کی کتابیں ہیں۔

اصلی اسلامی تحقیق کے وظائف

چونکہ اصلی اسلامی تحقیق ہمیشہ اسلام کی عقلی اور علمی بنیادوں کے خلاف زمانہ کے عقلی اور علمی چیلنج کا جواب ہوتی ہے لہٰذا وہ دو اہم وظائف ادا کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ان فلسفیانہ افکار کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ابطال کرتی ہے جو اس خاص زمانہ میں رواج پاکر مسلمان کے یقین و ایمان پر ایک مخالفانہ اثر پیدا کر رہے ہوں اور دوسرا یہ کہ وہ اسلام کی صداقت کو ثابت کرتی ہے اور تمام صحیح تصورات کو جو اس زمانہ میں دستیاب ہو سکتے ہوں، کام میں لاکر اسلامی افکار و اعتقادات کی مدافعت کرتی ہے۔ یہ دو وظائف ادا کرنا اس کے لئے اس طرح سے ممکن ہوتا ہے کہ اسلام کا محقق اسلام کی شدید محبّت اور اس کی صحیح تشریح اور تعبیر کرنے کی شدید خواہش کی وجہ سے ایک ایسا صحیح وجدان حاصل کر لیتا ہے اور اشیاء اور حقائق کے بارہ میں ایک ایسا صحیح نقطۂ نظر پیدا کر لیتا ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح افکار کو غلط افکار سے بآسانی ممیّز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

میکانکی اسلامی تحقیق کے وظائف

میکانکی اسلامی تحقیق کے لئے اسلام کی کسی بصیرت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور چونکہ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسلام کی محبّت کا نتیجہ ہو لہٰذا وہ اسلام کی محبّت کو نہ منعکس کرتی ہے اور نہ اسے دوسروں میں پیدا کر سکتی ہے۔ میکانکی اسلامی تحقیق کی اہمیت فقط یہ ہے کہ وہ اسلام کے عام طالب علم کے لئے اسلام کی مقدس کتابوں کا مطالعہ آسان کرتی ہے اور ان مقدس کتابوں کے مضمون کو اصلی اسلامی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے عالم دین کی آسان دسترس میں لاکر اس کی تحقیقی ضرورتوں کی خدمت اور اعانت کرتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اصلی اسلامی تحقیق سے شغف رکھنے والا عالم دین ایک ایسا ماہر تعمیرات ہے جو ایک خوبصورت عمارت کا نقشہ تیار کر کے اسے تعمیر کی ساری منزلوں سے گزارتا ہے اور میکانکی اسلامی تحقیق پر کام کرنے والا پڑھا لکھا آدمی وہ جفاکش مزدور ہے جو تعمیر میں کام آنے والی اینٹوں کو ڈھو کر اس ماہر تعمیرات کے قریب لے آتا ہے۔

مستشرقی تحقیق

ہو سکتا ہے کہ بعض وقت اسلام کی مقدس کتابوں پر خالص میکانکی تحقیق کا باعث یہ

ہو کہ تحقیق کرنے والے کو اسلام سے محبت ہے، لیکن اس کے کامیاب تتبع کے لئے اسلام کی صداقت پر ایمان و یقین کی موجودگی ایک شرط کے طور پر قطعاً ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں یہودی اور عیسائی مستشرقین بھی اسے بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس دور میں اس کے اصلی موجد مغرب کے یہودی اور عیسائی مستشرقین ہی ہیں۔ لیکن ایسی حالت میں اسے اسلامی تحقیق کا نام دینا ہرگز درست نہیں، کیوں کہ اس حالت میں یہ ایک وسیع تر تحقیق کا حصّہ ہے جسے مستشرقی تحقیق کہا جاتا ہے، اور جسے مغرب میں علماء کے ایسے گروہ نے ایجاد کیا تھا جو اپنے آپ کو "مستشرقین" کا نام دیتا تھا، کیونکہ وہ مشرقی ادب اور السنہ سے دلچسپی رکھتا تھا اور انہیں جاننا چاہتا تھا۔ مستشرقی تحقیق سراسر ایک میکانکی عمل ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کار یہ ہوتا ہے کہ ماضی میں عربی، فارسی، سنسکرت، چینی، انڈونیشی اور ترکی ایسی مشرقی زبانوں میں تاریخ، مذہب، فلسفہ، لغت، سائنس اور ادب وغیرہ کے موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان کا ترجمہ یا حاشیہ یا اختصار یا اشاریہ تیار کیا جائے یا ان کی تشریح یا توسیع یا تنقید بہم پہنچائی جائے۔

شروع میں اس تحقیق کے اغراض و مقاصد کلیتاً مشنری یا تبلیغی تھے۔ اس کے بعد جب اروپائی طاقتیں مشرق میں اپنی نو آبادیاں بنانے لگیں تو اس کے اغراض و مقاصد تبلیغی ہونے کے علاوہ انتظامی اور سیاسی بھی ہو گئے۔ مستشرقی مطالعات سے اہل مغرب کا ایک مقصد بلاریب یہ ہے کہ وہ اپنے ذوقِ دریافت کو مطمئن کریں اور ایک ایسی تہذیب کے مخفی آثار کو بے نقاب کر کے اپنی تفریح کا سامان بہم پہنچائیں جو ان کے خیال میں ہمیشہ کے لئے مٹ چکی ہے اور اپنی جگہ پر اس تہذیب کو چھوڑ گئی ہے جو اس سے کئی درجہ بلند تر اور برتر ہے اور جس کے وہ خود علمبردار ہیں۔ ان کا مقصد ویسا ہی ہے جیسا کہ ٹیکسلا کی کھدائی سے ہمارا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ سے ماضی کے متعلق لوگوں کی معلومات کی خواہش کی تشفی کے لئے یا ان کی تفریح کا ایک شغل پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی پرانی تہذیب کے دفن کئے ہوئے نشانات کو بے حجاب کرتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے مٹ چکی ہے۔ اب جبکہ مغرب کی تمام یونیورسٹیاں اپنے ہاں مستشرقی مطالعات کی کرسیاں قائم کر کے مستشرقی تحقیق کی سرپرستی کر رہی ہیں، مستشرقی تحقیق مغرب اور مشرق دونوں میں ایک

باعزت اور زر آفریں پیشہ بن گئی ہے۔ وقت کے گزرنے سے مستشرقین نے مستشرقی تحقیق کا ایک خاص فن ایجاد کر لیا ہے جو ہمارے السنۂ شرقیہ کے طالب مغرب کی یونیورسٹیوں میں ان سے سیکھتے ہیں۔ اب مشرق کی بہت سی یونیورسٹیوں میں بھی مشرقی علوم کی کرسیاں قائم ہو چکی ہیں اور یہ کرسیاں بالعموم ان لوگوں نے سنبھال رکھی ہیں جن کو مغربی مستشرقین نے مستشرقی تحقیق کے فن کی تربیت دی ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی تحقیق کا تعلق ہے یہ فن اس کے میکانکی حصّہ کے لئے کسی قدر سود مند ہو تو ہو ورنہ محض بے کار ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب

عربی اور فارسی کی کتابوں پر، جو بالعموم مسلمانوں نے لکھی ہیں، مستشرقین کی تحقیق کا سبب نہ اسلام کی محبّت ہے اور نہ مسلمان علماء اور فضلاء کی قدر دانی، بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان مستشرقین کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بالعموم ایک شدید قسم کا تعصب موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بھی وہ اپنے میکانکی کام سے ذرا ہٹ کر مسلمانوں کے معتقدات اور نظریات کی توجیہہ کرنے لگتے ہیں تو ان سے یہ توقع کرنا ہی عبث ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے متعلق کوئی موافقانہ رائے قائم کریں گے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحقیق کا ایک حصّہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اعتراضات سے معمور ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کے کام کے اس حصّہ کو نظر ثانی کے بعد ان کی غیر منصفانہ تنقید سے پاک کریں۔ لیکن جس حد تک مستشرقین کے کام کی اس قسم کی نظر ثانی مسلمانوں کی ایسی تصنیفات کے متعلق ہوگی جو اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر ہیں، ہم اسے میکانکی قسم کی اسلامی تحقیق بھی نہیں کہہ سکیں گے، بلکہ ہم اسے فقط ایسی مستشرقی تحقیق کا نام دے سکیں گے جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے انجام پائی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایسی کتابوں پر، جو اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر ہوں، مسلمانوں کی ساری تحقیق کو ہم مستشرقی تحقیق ہی کا نام دے سکتے ہیں۔

ایک غلط نام

بدقسمتی سے اس دوسری قسم کی تحقیق کو بھی غلط طور پر اسلامی تحقیق کا نام دیا جاتا

ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی عربی اور فارسی کتابوں پر تحقیق ہے۔ لیکن درحقیقت عہد قدیم کے مسلمانوں نے اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر جو کتابیں لکھی ہیں ان کو اسلامی کتابیں کہنے کا جواز اتنا ہی ہے جتنا اس بات کا جواز کہ ہم ایک مسلمان کے ہاتھ کے بنے ہوئے میز کو اسلامی میز کہہ دیں۔ اگر یہ کتابیں اسلامی کتابیں ہیں اور ان پر تحقیق اسلامی تحقیق ہے تو پھر اس زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر جو کتابیں لکھی ہیں، کیا وجہ ہے کہ ہم ان کو بھی اسلامی کتابیں نہ کہیں اور ان پر تحقیق کو بھی اسلامی تحقیق کا نام نہ دیں! لیکن نہ ہم ان کتابوں کو اسلامی کتابیں کہتے ہیں اور نہ ان پر تحقیق کو اسلامی تحقیق کا نام دیتے ہیں، تو پھر ہم کو اس بات پر اصرار کیوں ہے کہ گزشتہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی اس قسم کی کتابوں کو اسلامی کہہ کر پکاریں؟

آسمانی یا الہامی علم کے برخلاف ذہنی علم غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی، غیر واضح بھی ہو سکتا ہے اور واضح بھی، منظم بھی ہو سکتا ہے اور غیر منظم بھی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ یہودی یا عیسائی یا اسلامی ہو۔ علم ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ وہ ایک ہی منبع سے صادر ہونے والا ایک ہی نور ہے جو کبھی ایک فرد پر اور کبھی دوسرے فرد پر، کبھی ایک قوم پر اور کبھی دوسری قوم پر اپنی خوشی سے چمکتا ہے۔ ذہنی علم مذہبوں اور قوموں سے بالا ہے۔ یہی وجہ ہے جو لوگ اس علم کی تحصیل یا تحقیق میں منہمک ہوتے ہیں وہ مذہب یا قومیت سے قطع نظر کر کے ایک دوسرے سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

مستشرقی تحقیق کا ایک خاصہ

چونکہ مستشرقی تحقیق فقط ایک میکانکی عمل ہوتا ہے اور اس کے پاس کوئی نئی چیز کسی کو دینے کے لئے نہیں ہوتی، اس کا ایک خاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت زور دیتی ہے، مثلاً ایک مستشرق اپنی پوری زندگی یہ ثابت کرنے پر صرف کر دے گا کہ ایک مصنف یا اس کی کسی کتاب کا صحیح نام یہ ہے اور وہ نہیں، یا فلاں شخص جس مقام پر پیدا ہوا تھا وہ فلاں گاؤں سے اتنے میل شمال کو تھا اور جنوب کو نہیں، یا جس تاریخ کو پیدا ہوا تھا وہ پانچ دن پہلے تھی اور پیچھے نہیں۔ اگرچہ وہ شخص خود ایک عالم کے طور پر کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو اور بالکل اس قابل ہو کہ فراموش کر دیا جائے، لیکن وہ اس لئے اہم سمجھا جاتا ہے

کہ کسی پرانی کتاب میں اس کا نام آگیا ہے۔

مسلمان مستشرق کا اصلی کام

اگر مستشرقی تحقیق کا مقصد یہ ہوتا کہ مشرق کے گزشتہ علماء اور فضلاء کے علمی کارناموں کو اجاگر کیا جائے (اور اس میں شک نہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مشرق علوم وفنون میں کرۂ ارض کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصّہ تھا) اور اس کا تعلق دورِ حاضر کی علمی ترقیوں کے ساتھ واضح کیا جائے تو پھر بھی یہ اسلامی تحقیق کا کام نہ ہوتا۔ اگرچہ یہ عمومی طور پر علم کی بہت بڑی خدمت ہوتی، کیوں کہ اس سے نوع انسانی کی علمی جدوجہد کے ماضی کو اس کے حال کے ساتھ جوڑ کر اس کے تسلسل کو آشکار کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اس وقت مستشرقی تحقیق کا کام نہ مغرب میں ان خطوط پر ہو رہا ہے اور نہ مشرق میں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے لئے نہ صرف عہد قدیم کی علمی دنیا سے بلکہ عصر حاضر کی علمی دنیا سے بھی پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ وہ اصلی کام ہے جو مستشرقین کو، بالخصوص مسلمان مستشرقین کو انجام دینا چاہئے۔

آخر جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، ہمارا مقصد علم کی جستجو ہونا چاہئے نہ کہ مشرقی علم کی جستجو، علم نہ مشرقی ہو سکتا ہے نہ مغربی۔ کم از کم ہمارے بزرگوں نے علم کی کوئی ایسی تقسیم نہ کی تھی اور نوع انسانی کے جن بیش بہا علمی کارناموں کا سہرا آج ان کے سر باندھا جا رہا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ اگر درخشندہ علمی ستاروں کا وہ طویل وعریض جم گھٹا جو مسلمان علماء اور فضلاء پر مشتمل تھا اور اب غائب ہو چکا ہے، یکایک پھر زندہ ہو جائے تو وہ سب بلا توقف اس بات کی کوشش کریں گے کہ مغرب کے سارے علوم کو سیکھ کر ان کے ماہر بن جائیں۔ اگر مستشرقی تحقیق سے مدعا فی الواقع علم کی جستجو ہے تو یہ بات اس مدعا سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کہ ایسی تحقیق یا ایسے مطالعہ کے لئے لفظ مستشرقی کا اور مسلمان علماء کے لئے لفظ مستشرقین کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے۔ ان الفاظ کا استعمال ہم نے درحقیقت اہل مغرب کی کورانہ تقلید میں شروع کیا تھا جو مستقل طور پر مغرب میں رہتے ہیں اور اپنا ایک مستقل مشرق رکھتے ہیں۔ ہم مشرق میں بھی رہتے ہیں اور مغرب میں بھی تمام زبانیں ہماری ہیں۔ دنیا بھر میں مشکل سے کوئی ایسی زبان ہوگی جو

حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو عقل سے کام لینے کی بار بار ہدایت کی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم ہر مدعی نبوت کو نبی نہیں مانتے اور جھوٹے اور سچے نبی میں اپنی عقل کو کام میں لاکر فرق کرتے ہیں؟

دوم : یہ کہ خدا کی وحی ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے جو آخر کار ضبط تحریر میں آجاتے ہیں اور ایک خارجی وجود رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی پڑھنے والا یا سننے والا ان الفاظ پر ایمان لائے اور ان کے مطابق عمل کرے' یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ذہن کے اندر کسی مطلب یا معنی یا مدعا میں تبدیل ہوں۔ جب تک کہ وہ ایک خارجی حقیقت سے ایک داخلی احساس میں تبدیل کرنے والے اس عمل میں سے نہیں گزرتے (اور یہ یاد رہے کہ تبدیلی کا یہ عمل سراسر ذہنی اور انسانی ہے' خدائی یا آسمانی نہیں) دوسرے لفظوں میں جب تک کہ وہ ایک علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس نہیں پہن لیتے اس وقت تک نہ تو وہ ایمان پیدا کر سکتے ہیں نہ عمل۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی وحی کا اتباع کرنے والے لوگوں کے اعتقادات اور اعمال مختلف ہیں۔ اور اسلام' جو ایک ہی ہے' مذہبی فرقوں اور مذہبی تحریکوں میں اس قدر بٹا ہوا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم قرآن حکیم کے مطالب کو سمجھتے اور سمجھاتے اور سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ ہمارے اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کو اس علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس پہنانا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال کے مطابق ان کی اپنی صحیح توجیہہ ہے۔

سوم : یہ کہ خدا کی وحی ہمیں انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک صحیح نظریہ عطا فرماتی ہے اور فلسفہ کی صورت میں انسان کی عقل بھی انسان اور کائنات کا صحیح نظریہ بہم پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ عقل انسانی کا یہ وظیفہ جو اس نے خود بخود اپنے لئے تجویز کر لیا ہے' بیک وقت خدا کی وحی کا وظیفہ بھی ہے۔ لہٰذا عقل انسانی خدا کی وحی کے بیانات قبول کر لینے کے بعد بھی ان کو زیر غور لانے کی طرف مائل رہتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ جن سوالات کا قطعی جواب خدا کی وحی پہلے ہی دے چکی ہے یہ ان سوالات کا کوئی ایسا جواب بھی ڈھونڈ نکالے جو اس کے اپنے لئے بھی مکمل طور پر تسلی بخش ہو۔ مثلاً ایک سوال ہے کیا خدا فی الواقع موجود ہے؟ ایک آدمی اس سوال کے اس جواب پر جو خدا کی

وحی نے دیا ہے' مکمل یقین اور ایمان رکھا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک انسان کی حیثیت سے یعنی ایک دارائے عقل و فہم وجود کی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سوال کا وہ جواب بھی اپنے پاس موجود رکھے جو اس کی عقل اس کے لئے مہیا کرتی ہے۔ لیکن جب وہ ایسا کرے گا تو وہ مجبور ہو گا کہ دونوں کے جوابات کے اندر مطابقت پیدا کرے اور اسے قائم رکھے۔ ورنہ وہ دونوں سے پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے گا۔

علمی ترقی کے ہر نئے دور میں اسلام کی نئی عقلی توجیہہ کی ضرورت

نوع انسانی کا ذہنی علم ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے اور نئے حکیمانہ افکار کے اس مجموعہ کے اندر جو کسی دور میں رونما ہوتا' ہے حق باطل کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر دور میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اصلی اسلامی تحقیق کی طرف رجوع کر کے حق کو باطل سے الگ کیا جائے اور غلط اور مخالف اسلام حکیمانہ تصورات کی تردید کی جائے اور صحیح اور موافق اسلام حکیمانہ تصورات کو کام میں لا کر اسلام کی تائید مزید اور حمایت اور مدافعت کی جائے۔ ہر دور میں اصلی اسلامی تحقیق کے ماہرین کے لئے یہ اہم کام موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے نئے علمی افکار کے دانہ کو کاہ سے الگ کریں' دانہ کو کام میں لائیں اور کاہ کو پھینک دیں کہ ہوائیں اس کو اڑا کر لے جائیں۔

دورِ حاضر میں اسلام کو حکیمانہ افکار کا چیلنج

تاہم علمی ترقی کے کسی دور میں بھی اسلام کو حکیمانہ افکار کی طرف سے ایسا زوردار اور خطرناک چیلنج کبھی نہیں دیا گیا جیسا کہ اب دورِ حاضر کے حکیمانہ افکار نے دیا ہے۔ اس وقت فلسفی' ماہر تاریخ' ماہر اقتصادیات' ماہر معاشیات اور ماہر نفسیات سب مل کر اسلام کی جڑوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ میکانکی ارتقاء' تحلیل نفسی' حکمیاتی سوشلزم' تاریخی مادّیت' منطقی اثباتیت' کرداریت اور موجودیت کے نظریات' جن کی مقبولیت اس زمانہ میں ہر روز بڑھتی جا رہی ہے اور جو نوع انسانی کے اعمال و افعال کو نہایت تیزی سے متاثر کر رہے ہیں' ہمارے مذہب کی بنیادوں کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ اگر ہم ان نظریات کے علمی چیلنج کا مؤثر جواب نہ دیں اور ان کی یقین افروز تردید نہ کریں تو ہم مسلمان کی

حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان نظریات کا جواب دیتے ہوئے ہمیں اس بات کو بھی یاد رکھنا ہو گا کہ اگر ہمارا جواب دور حاضر کے علمی معیاروں پر پورا نہ اتر سکے اور اپنے استدلال کے حقائق اور تکنیک اور طریقہ سے دنیا بھر میں چوٹی کے علماء اور حکماء کو مطمئن نہ کر سکے تو وہ ہرگز کوئی جواب نہ ہو گا۔ اس قسم کا جواب علماء کرام نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ کہاں ہیں وہ بزرگانِ دین جن کو خدا نے مسلمانوں کی قیادت کے بلند مقام پر فائز کیا ہے اور جن کے نورِ ایمان اور زورِ قلم نے قرآن کی تفسیروں اور اسلامی کتابوں کے قابل قدر ذخیروں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ وہ کیوں اس خطرہ کو محسوس نہیں کرتے؟ افسوس کہ وہی علماء دین جو کل تک اسلام اور کفر کی جنگ میں ہر محاذ پر اسلام کی مدافعت کے لئے پیش پیش رہتے تھے آج سو گئے ہیں اور اسلام کو جو نیا خطرہ درپیش ہے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اس کے مقابلے کے لئے تیار کرنے کی کوشش کرنا تو درکنار اس کا ذکر تک نہیں کرتے۔ گویا اس کی موجودگی سے ہی ناآشنا ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم مفکرین بھی' جو ہمارے مخالف ہیں' اس خطرہ سے ہماری غفلت اور اس کے مقابلہ میں ہماری عافیت کوشی اور سہل انگاری پر ہمیں طعنہ دے رہے ہیں۔ پروفیسر ڈبلیو ڈی سمتھ اپنی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" (Modern Islam in India) میں لکھتا ہے :

"جہاں دس یا بیس سال پہلے بازاروں کے موڑوں پر مذہبی مناظرے ہوا کرتے تھے اور تعلیم یافتہ مسلمان افکار جدید کے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ اپنا سر کھپاتے تھے' آج مسلمان نوجوان ان علمی مشکلات سے بے خبر اور بے پرواہے جو زندگی کے صحیح راستہ کی حیثیت سے مذہب کو پیش آتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے آزاد خیال مسلمانوں نے ان اعتراضات کا قریباً مکمل جواب دیا جو عیسائیوں نے اسلام پر وارد کئے تھے۔ آج تجدد پسند مسلمان اس جواب کو کافی سمجھتا ہے اور کوئی مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوتا جو جواب دینا تو درکنار ان اعتراضات کا فقط ذکر ہی کرے جو اس زمانہ میں فلسفی' مؤرخ' ماہر نفسیات اور ماہر اجتماعیات نے اسلام پر اور سارے مذہب پر وارد کر رکھے ہیں۔ جس طرح انیسویں صدی کے کٹر مسلمان' جو عیسائیوں اور آزاد خیال مغربیوں کے

اعتراضات کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے اور سرسید احمد اور امیر علی کو ان کا جواب دینے کی وجہ سے برا سمجھتے تھے' معاشرتی قدامت پسندی کا سہارا تھے اسی طرح سے وہ مسلمان بھی جو ان جدید اعتراضات کا جواب دینے سے قطع نظر کرتے ہیں ان جماعتوں کی ہی اعانت کر سکتے ہیں جو معاشرتی اعتبار سے قدامت پسند ہیں"۔

مسلمانوں سے عصر جدید کے انسان کا مطالبہ

اسلام نے دور جدید کے انسان کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کر دیئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ ان کا ایک ایسا جواب مہیا کریں جو مدلل اور حکیمانہ ہو اور اس قابل ہو کہ ایک ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی کو قائل کر سکے۔ ان میں سے بعض سوالات یہ ہیں :

۱۔ کیا یہ بات درست نہیں کہ حقیقت کائنات مادی ہے اور روح مادہ کی ایک خاصیت ہے جو اس وقت رونما ہوتی ہے جب مادہ اپنی ترقی اور ترکیب کی ایک خاص حالت پر پہنچ جاتا ہے؟

۲۔ کیا یہ بات درست نہیں کہ مذہب فقط معاشی حالات کی پیداوار ہے اور خود اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا؟

۳۔ کیا انسان کی زندگی کا معاشی پہلو عمل تاریخ کا محرک نہیں اور کیا مذہب اس عمل تاریخ کی ایک عارضی حالت اور ضمنی یا اتفاقی پیداوار نہیں؟

۴۔ کیا مذہب دبی ہوئی جبلت جنس یا رکی ہوئی حب تفوق یا انکی ہوئی غلبہ و قوت کی خواہش کا غیر فطری اور بے محل اظہار نہیں؟

۵۔ کیا مذہب ایک ظالم سوسائٹی کا مصنوعی دباؤ نہیں جو اپنی سلامتی کی خاطر فرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کچھ غیر فطری پابندیوں اور رکاوٹوں کو' جنہیں وہ مذہبی اور اخلاقی اصولوں کا نام دیتی ہے' اپنے آپ پر عائد کرے؟

۶۔ کیا یہ درست نہیں کہ عمدگی اخلاق ایک نسبتی اصطلاح ہے جس کے معنی مختلف قوموں کے لئے اور مختلف حالات کے اندر مختلف ہوتے ہیں؟

۷۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کسی انسان پر وحی نازل کرے یا کوئی انسان سچ مچ نبی بن جائے؟

۸۔ کیا نبوت (اگر وہ درحقیقت ممکن ہے) ایک ایسا عارضی اہمیت کا واقعہ نہیں جو نوعِ انسانی کی تاقیامت ترقی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتا؟

۹۔ کیا انسان کی عقل اسے اپنا نیک و بد سمجھانے کے لئے کافی نہیں کہ کسی بیرونی راہنمائی کی ضرورت ہو؟ جب انسان کو عقل دی گئی ہے تو اس نبوت کی خاص ضرورت کیا ہے؟

۱۰۔ اگر نبوت کوئی ضروری چیز ہے تو یہ ختم کیوں ہو جاتی ہے اور تاقیامت انسان کی راہنمائی کے لئے نئے نئے انبیاء کیوں آتے نہیں رہتے؟ وغیرہ

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان سوالات کا ایسا جواب تلاش کریں جو نہ صرف اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مطابق ہو بلکہ پوری طرح سے مدلل اور معقول اور حکمیاتی (Scientific) ہو۔ اور کم از کم ان تمام جوابات سے زیادہ معقول اور قابل قبول ہو جو دوسرے مذاہب یا نظریات کے ماننے والے ان ہی سوالات کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب امت مسلمہ کے ضمیر نے غیر واضح طور پر ہی سہی، لیکن اس بات کو محسوس کر لیا ہے کہ اگر ہم اس قسم کا جواب، جو درحقیقت اسلام کی مکمل اور منظم حکمیاتی تشریح سے کم نہیں ہو گا، فی الفور مہیا نہ کریں تو ایک نظریاتی جماعت کی حیثیت سے ہماری زندگی خطرہ میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تحقیق کی ضرورت کا ایک عام احساس پیدا ہو گیا ہے۔

موجودہ دور کی ایک خصوصیت

اس زمانہ میں انسان کے نظریات بدنی اور جبلتی ضروریات کی سطح سے بالاتر ہو کر علمی اور اخلاقی سطح پر آ گئے ہیں۔ لہٰذا نظریات کی حیثیت سے ان کی موجودگی پوری طرح سے نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ زمانہ علمی نظریات کا زمانہ ہے۔ اس دور میں اسلام کے سوائے باقی تمام نظریات کے قائلین اپنے اپنے نظریات کی علمی اور عقلی توجیہہ اور مدافعت بہم

پہنچانے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان کی سیاسی زندگی بلکہ ہر قسم کی زندگی خطرہ میں رہے گی۔ نظریہ' جو دراصل انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک مشاہدہ یا وجدان یا ایمان کا نام ہے' تنہا وہ قوت ہے جو فرد اور جماعت اور ریاست کے تمام اعمال و افعال پر حکمران ہے۔ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ نظریہ حیات جس پر کسی ریاست کی بنیاد رکھی گئی ہے' علمی طور پر صحیح اور عقلی طور پر اعتراضات سے بالا ہے تو اس سے دو اہم نتائج برآمد ہوں گے۔ ایک یہ کہ اس سے ریاست کے ساتھ فرد کی کشش یا محبت بڑھ جائے گی اور ریاست کا اندرونی اتحاد ترقی پائے گا اور اس کی استعداد عمل میں اضافہ ہو گا' اور اس کی قوت فروغ پا کر انتہا تک پہنچ جائے گی۔ اس کا دوسرا اہم نتیجہ یہ ہو گا کہ ریاست کی حدود کے باہر ریاست کے حامیوں اور مددگاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے گی اور اس طرح سے اس کے سیاسی اثر و نفوذ کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جائے گا۔ جس قدر کوئی نظریہ حیات زیادہ معقول و مدلل ہو گا اور جس قدر زیادہ دل کش اور دلنشیں ہو گا اسی قدر زیادہ امکان اس بات کا ہو گا کہ وہ ترقی پا کر زمین کے کناروں تک پھیل جائے اور وہاں ہمیشہ کے لئے موجود رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریہ کے ماننے والے اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی ایک بلند پایہ علمی اور عقلی تشریح پیدا کریں۔ اشتراکیت پہلے ہی ایک سائنسی نظریہ حیات ہونے کی مدعی ہے۔ ہٹلر کا نظریہ نیشنل سوشلزم اس کی کتاب "میری جدوجہد" میں ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ ہیگل کے اس نظریہ کی ایک تشکیل جدید تھی کہ ریاست ایک خدا ہے جو غیر محدود حقوق اور اختیارات رکھتی ہے اور اطاعت مطلقہ کی حق دار ہے۔ مسولینی کا نظریہ فسطائیت بھی اطالوی فلسفی کروچے کے فلسفیانہ نظام سے عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا تھا۔ امریکہ کے لوگ اب جمہوریت کو محض ایک طرز حکومت نہیں سمجھتے بلکہ ایک فلسفہ زندگی سمجھتے ہیں۔ اور بعض امریکی مصنفین نے اسے ایک فلسفہ زندگی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بھارت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ریاست گاندھی کے فلسفہ زندگی پر مبنی ہے۔

ایک نظریہ حیات غلط ہو یا صحیح لیکن وہ لوگ جو اس سے محبت رکھتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی نظریہ حیات دنیا میں حق ہے یا حق ثابت کیا جا سکتا ہے تو یہی ہے۔ جب وہ اس

کی عقلی اور علمی توجیہہ یا مدافعت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا مقصد در حقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام حکمت کو آشکار کریں جو عقلی لحاظ سے دنیا کے تمام فلسفوں میں یکتا اور یگانہ ہے' جو صرف ان کے نظریہ حیات کے اندر مخفی ہے اور دنیا بھر میں اور کہیں پایا نہیں جاتا۔ ہر نظریہ حیات کا ماننے والا اپنے نظریہ حیات کے متعلق ایسا ہی خیال رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ حق صرف ایک ہے' یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی فلسفہ ایسا ہو سکتا ہے جو در حقیقت صحیح اور معقول ہو' دو یا دو سے زیادہ فلسفے ایسے نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ اپنی اپنی سائنسی توجیہہ اور تشریح کرنے کے لئے نظریات کی دوڑ میں صرف ایک نظریہ حیات کامیاب ہو گا اور وہی نظریہ حیات زندہ رہے گا اور پوری دنیا پر چھا جائے گا اور باقی نظریات مٹ جائیں گے اور زندہ رہنے والے اس نظریہ حیات کے متعلق یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جائے گی کہ یہی انسان اور کائنات کا وہ آخری صحیح فلسفہ ہے جو عقل انسانی کی صبح کے طلوع سے لے کر آج تک تمام فلسفیوں اور سائنس دانوں کا سہانا خواب اور ان کی جستجو کا گوہر مقصود بنا رہا ہے۔ یہ باور کرنے کے لئے ہر دلیل موجود ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ حیات ہے جو اس قابل ہے کہ انسان اور کائنات کی ایک عقلی' علمی اور سائنسی تشریح کی صورت اختیار کر سکے' لیکن اب تک ہم نے کون سا کام کیا ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارا یہ عقیدہ فی الحقیقت درست ہے۔ اس معاملہ میں ہماری غفلت کو اس حقیقت نے اور زیادہ سنگین اور خطرناک بنا دیا ہے کہ دوسرے نظریات کو ماننے والے لوگ اس وقت بھی دنیا کے اوپر یہ ثابت کرنے کے لئے بہت سا کام کر چکے ہیں کہ صرف ان کے نظریات ہی معقول اور مدلل ہیں۔ اور دنیا کا تعلیم یافتہ طبقہ یعنی نوع انسانی کا وہ حصہ جو در حقیقت کوئی اہمیت رکھتا ہے اور جس میں تعلیم یافتہ مسلمان بھی شامل ہیں ہر روز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کے ہمرنگ زمیں دام میں گرفتار ہوتا جا رہا ہے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

امام ابنِ خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ

—— عبدالرشید عراقی ——

امام ابنِ خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور ائمہ فن میں ہوتا ہے۔ احادیث پر اُن کی نظر وسیع تھی اور احادیث میں ان کی گہری بصیرت ابتداء ہی سے تھی۔ اس لئے چھوٹی عمر میں حافظِ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔

حِفظ و ضبط اور عدالت و ثقاہت میں اُن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ حدیثوں کے اسناد و متون میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ علمائے فن نے اُن کے حفظ و ضبط اور عدالت و ثقاہت کا اعتراف کیا ہے اور اُن کو ثقہ و ثابت کہا ہے۔ امام ابنِ حبّان فرماتے ہیں کہ :

"روئے زمین پر احادیث و سنن کے صحیح الفاظ اور زیادات کی یادداشت رکھنے والا اُن کی مانند کوئی اور شخص نہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنن و احادیث کا تمام ذخیرہ اُن کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔"

احادیث میں ان کی گہری بصیرت تھی اور حدیث سے مسائل مستنبط کرنے میں اُن کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ امام ابو اسحاق شیرازی نے حدیث سے مسائل مستنبط کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ امام شافعی کے مشہور شاگرد امام مُزنی سے ایک عراقی شخص نے دریافت کیا کہ قرآن مجید نے قتل کی صرف دو صورتیں بیان کی ہیں 'عَمد و خطاء' تو تیسری قسم شبہِ عَمد کو آپ کس طرح مانتے ہیں؟ انہوں نے ایک حدیث پیش کی۔ اس نے کہا کہ آپ علی بن زید بن جدعان کی روایت سے استدلال پیش کرتے ہیں۔ یہ سن کر امام مُزنی خاموش ہو گئے۔ امام ابنِ خزیمہ نے اس عراقی شخص کو بتایا کہ شبہِ عَمد کی روایتیں دوسرے طرق سے بھی دو ہی ہیں' اور امام ابنِ خزیمہ نے اس کو تفصیل بتائی تو عراقی شخص خاموش ہو گیا اور امام مزنی سے کہنے لگا کہ مناظرہ آپ کر رہے ہیں یا یہ؟ تو امام مزنی

نے جواب دیا : جب حدیثوں پر گفتگو ہوتی ہے تو میں خاموش رہتا ہوں' اس لئے کہ یہ مجھ سے زیادہ احادیث میں بصیرت اور واقفیت رکھتے ہیں۔

حافظ ابنِ سبکی کہتے ہیں کہ امام ابنِ خزیمہ مسائل کا جواب بھی احادیث کی روشنی میں دیتے تھے۔ امیر اسمٰعیل بن احمد نے ایک مرتبہ ان سے "فَے وغنیمت" کا فرق دریافت کیا تو امام ابنِ خزیمہ نے سورۃ الانفال کی آیت ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ﴾ آخر تک پڑھنے کے بعد چند حدیثیں بیان کیں۔ پھر سورۃ الحشر کی آیت ﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ﴾ آخر تک پڑھ کر احادیث سے مسئلہ کی وضاحت کی۔ ابو زکریا یحییٰ بن محمد بیان کرتے ہیں کہ میں اس موقع پر موجود تھا۔ امام ابنِ خزیمہ نے اس مسئلہ کی وضاحت میں ۱۷۰ احادیث بیان فرمائیں۔

حدیث سے مسائل کا استنباط اور اس کی نقل و روایت میں ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ابنِ جوزی لکھتے ہیں :

وکان مبرزا فی علم الحدیث

"وہ علم حدیث میں بہت ممتاز اور نہایت فاضل تھے"۔

احیائے سنّتِ نبوی ﷺ اور اشاعت حدیث میں بھی ان کی خدمات قدر کے قابل ہیں۔ علمائے اسلام نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ امام ابنِ خزیمہ کے علم و فضل اور ان کے صاحبِ کمال ہونے کا اعتراف ان کے معاصر علماء اور اربابِ سیر و تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ان کو عدیم النظیر' فرید العصر اور بحر من بحُورِ العلم کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ان کے استاد ربیع بن سلیمان کا بیان ہے کہ : "ابنِ خزیمہ نے ہم سے جتنا استفادہ کیا ہم نے اس سے زیادہ ان سے استفادہ کیا۔"

علامہ ابنِ سبکی لکھتے ہیں :

"وہ مختلف علوم کے جامع اور مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ اور نیشاپور میں' جو علم و فن کا مرکز تھا' یکتائے روزگار تھے۔ عقل و فطانت میں بے مثال تھے۔ بحث و مناظرہ میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور علوم اسلامیہ کا بحرِ زخّار تھے۔ اس لئے علماء و اساطینِ فن بھی ان سے استفادہ کرتے تھے"۔

ولادت

امام ابو بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ ماہ صفر ۲۲۳ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔

اساتذہ و تلامذہ

ان کے مشہور اساتذہ میں ابو قدامہ سرخسی، علی بن حجر، ربیع بن سلیمان اور یونس بن عبد الاعلیٰ جیسے محدّثین اور ائمۂ فن شامل ہیں۔ امام اسحاق بن راہویہ اور امام محمد بن حمید رازی سے بھی ان کو ملاقات اور سماع کا شرف حاصل تھا۔ اُس وقت کم سن تھے اس لئے احتیاط کی بناء پر اُن سے حدیثیں بیان نہیں کرتے تھے۔

ان کے تلامذہ میں امام ابو علی نیشاپوری اور امام ابو بکر احمد بن میران مقری جیسے جیّد علمائے کرام شامل تھے۔

رحلت و سفر

علم و فن کی تحصیل اور حدیث و فقہ کی تکمیل کے لئے امام ابنِ خزیمہ مختلف اسلامی شہروں میں تشریف لے گئے۔ اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ امام ابنِ خزیمہ اپنے وطن نیشاپور میں اساطینِ فن سے استفادہ کے بعد رَے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق، مصر اور واسط وغیرہ تشریف لے گئے اور ہر جگہ اساطین فن اور نامور علمائے کرام سے اکتسابِ فیض کیا۔

فقہ و اجتہاد

فقہ و اجتہاد میں بھی امام ابنِ خزیمہ کا مرتبہ بہت بلند تھا اور فقہ میں امام مزنی سے استفادہ کیا تھا۔ لیکن فقہ میں وہ کسی مذہب سے وابستہ نہیں تھے، بلکہ ان کا شمار مجتہدینِ مطلق میں ہوتا ہے۔ علامہ ابنِ سبکی نے ان کو "المُجتہد المُطلق" اور حافظ ابنِ کثیر نے "وھو من المجتھدین فی دین الاسلام" لکھا ہے اور خود امام ابنِ خزیمہ فرمایا کرتے تھے کہ "سولہ سال کی عمر کے بعد میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔"

امام ابو اسحاق شیرازی نے "طبقات الفقہاء" میں ابو زکریا یحییٰ بن محمد نمیری کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ :

میں نے امام ابنِ خزیمہ سے خود سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ : "رسول اللہ ﷺ کے صحیح فرمان کی موجودگی میں کسی شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔"

امام ابنِ خزیمہ خود صاحبِ مذہب اور مستقل امامِ فقہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ حافظ ابنِ قیم لکھتے ہیں کہ :

"محمد بن اسحاق بن خزیمہ امام الائمہ کے لقب سے موسوم کئے جاتے تھے۔ ان کے متبعین ان کے مذہب کی پیروی کرتے تھے۔ وہ مقلد کے بجائے خود امام مستقل اور صاحب مذہب تھے۔"

عقائد و کلام کے بارے میں امام ابنِ خزیمہ کے بعض مسائل

حافظ ذہبی نے امام ابنِ خزیمہ کے بعض مسائل جن کا تعلق عقائد اور علمِ کلام سے ہے، تذکرۃ الحفاظ میں نقل کئے ہیں۔ مثلاً امام صاحب بدعات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اپنے تلامذہ کو سختی سے اس بات کی ہدایت کرتے تھے کہ غیر ضروری مسائل میں بحث و تمحیص نہ کی جائے۔

عقائد و کلام سے متعلق انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں اہل سنّت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ چند مسائل کے بارے میں آپ کی آراء یہاں نقل کی جاتی ہیں :

۱) قرآن مجید خدا کا کلام ہے، اس کی وحی و تنزیل ہے اور غیر مخلوق ہے۔ قرآن کو کلامِ الٰہی کی بجائے مخلوق کہنے والا کافر ہے۔ اس سے توبہ کرائی جائے گی۔ اگر توبہ نہ کرے تو قتل کیا جائے گا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔

۲) بعض جاہل کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکرر کلام نہیں کرتا۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں اور کلامِ الٰہی سے ناآشنا ہیں اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر تخلیق آدم کا کئی بار ذکر فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مکرر بیان کیا ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ بار بار کہا گیا ہے۔ یہ کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ ازل میں کلام کرنے کے بعد پھر کلام نہیں کرتا وہ جہمی ہے۔ اللہ عرش پر بلاکیف مستوی و متمکن ہے۔ جہمیہ اور کلامیہ ملعون اور اپنے خیالات و عقائد میں جھوٹے ہیں۔

اتباعِ سُنّت

امام ابنِ خزیمہ کا اتّباعِ سُنّت میں بڑا اہتمام تھا۔ ہر بات میں وہ سُنّتِ نبوی ﷺ کا لحاظ رکھتے تھے۔ صاحبِ کرامات بھی تھے۔ اور لوگ ان کی ذات کو نہایت بابرکت خیال کرتے تھے۔

امامت و شہرت

اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی مرجعیت اور شہرت عطا فرمائی تھی۔ "امام الائمہ" ان کے نام کا جزو بن گیا تھا۔ ان کے ہاں علماء و طلبہ کا ہجوم رہتا تھا جو اُن سے علومِ اسلامیہ کا استفادہ کرتے تھے۔ مستفیدین کے قافلے ہر وقت خیمہ زن رہتے تھے۔ امراء و اربابِ حشمت بھی ان کی تکریم و تعظیم کرتے تھے۔

وفات

امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے ۲ ذی قعدہ ۳۱۱ھ کو نیشاپور میں انتقال کیا اور اپنے گھر کے ایک کمرہ میں دفن ہوئے۔

ایک شاعر نے آپ کی وفات پر بڑا پُر درد مرثیہ لکھا، جس کے دو شعر یہ ہیں :

"اے ابنِ اسحاق! آپ کی زندگی نہایت قابلِ ستائش تھی۔ آپ کی قبر کو ہمیشہ برسنے والے بادل سیراب کرتے رہیں! آپ اہلِ علم کے سرپرست اور ان کی مشکلات میں کفیل تھے۔ آپ کے اُٹھ جانے سے یہ سب ختم ہو گیا۔ ہم نے آپ کے بجائے علم کو دفن کیا ہے۔"

تصانیف

امام ابنِ خزیمہ نامور مصنف تھے۔ حافظ ابنِ کثیر کا بیان ہے : "فکتب الکثیر و صنّف و جمع" یعنی بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔

امام ابنِ خزیمہ کی تین کتابوں کے نام تاریخ نے محفوظ کئے ہیں۔

① فقہ حدیثِ بریرہ : یہ کتاب تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک حدیث کی حقانیت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲) <u>کتاب التّوحید والصّفات</u> : یہ بڑی مفید' عمدہ' نفیس اور اہم کتاب ہے اور کئی اجزاء پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع کلام و عقائد ہے۔ امام رازی نے اس کو "کتاب الاشراک" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(۳) <u>صحیح ابن خزیمہ</u> : یہ امام ابنِ خزیمہ کی بڑی مشہور اور اہم کتاب ہے اور اس کا شمار حدیث کی اہم اور مشہور کتابوں میں ہوتا ہے۔ محدّثین صحاحِ ستّہ کے علاوہ جن محدّثینِ کرام نے اپنی کتابوں میں صحت کا زیادہ التزام کیا ہے' ان کے مجموعے صحیح کہلاتے ہیں' ان مجموعوں میں صحیح ابنِ خزیمہ بھی شامل ہے۔ حافظ ابنِ کثیر اس کے بارے میں فرماتے ہیں : "مِن أنفع الکتب واجلها" یعنی صحیح ابنِ خزیمہ نہایت مفید اور اہم کتابوں میں سے ہے۔

حافظ ابنِ حجر نے صحیح ابنِ خزیمہ پر مفید حواشی بھی لکھے تھے۔

صحیح ابنِ خزیمہ طبع ہو چکی ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مترجم کا نام مولانا حافظ محمد ادریس سلفی ہے اور اسے مکتبہ دارالسلام محمدی مسجد کراچی نے شائع کیا ہے۔

<u>مراجع و مصادر</u>

۱) ابنِ جوزی' المنتظم
۲) ابنِ سبکی' طبقات الشافعیه
۳) ابنِ قیم' اعلام الموقعین
۴) ابنِ کثیر' البدایة والنهایة
۵) ابو اسحٰق شیرازی' طبقات الفقهاء
٦) حاجی خلیفہ' کشف الظنون
٧) ذہبی' تذکرة الحفاظ
۸) عبدالرحمٰن مبارک پوری' مقدمہ تحفۃ الاحوذی
۹) شاہ عبدالعزیز دہلوی' عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

ٹیپو سلطان - ایک عظیم سالار

تحریر: ڈاکٹر غزالہ بٹ ☆

آں شہیدانِ محبت را امام! آبروئے ہند وچین وروم وشام!

سرزمین ہند پر بے شمار مسلمان حکمرانوں اور خاندانوں نے حکومت کی۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اسلام کا نام سربلند کیا اور اسلامی سلطنت کی تعمیر وترقی میں کوشاں رہے۔ ان حکمرانوں میں ایک حکمران ایسا بھی تھا جس نے اس دور میں جب اس کے دیگر حکمران ساتھی انگریز کی بالادستی کو قبول کر چکے تھے' ان کی بالادستی اور اطاعت قبول نہ کی اور بالآخر لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ اس عظیم سپہ سالار کا نام سلطان فتح علی ٹیپو تھا۔

پیدائش

ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی خان کی شادی صوبہ سرا کے سید شہباز پیرزادہ عرف شاہ میاں صاحب کی بڑی لڑکی سے ہوئی۔ حیدر علی خان کی زوجہ کچھ عرصہ کے بعد بیمار ہو گئیں اور انہوں نے برضا و رغبت دوسری شادی کی اجازت دے دی۔ آپ کی دوسری شادی گرم کنڈہ کے قلعدار کی بہن فاطمہ بیگم سے ہوئی۔ حیدر علی خان کا فرزند اکبر ۱۰ نومبر ۱۷۵۰ء بمطابق ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۲ھ جمعہ کے دن ''دیون ھلی'' (بنگلور سے ۲۰ میل دور شمال میں) میں پیدا ہوا۔[1]

کہا جاتا ہے کہ بزرگ مستان ولی نے کہا تھا کہ تمہارے گھر جو لڑکا پیدا ہو گا وہ

☆ لیکچرر اسلامیات' گورنمنٹ کالج برائے خواتین ' سمن آباد' لاہور

بہت بڑا حکمران ہوگا' اس لئے تم اس کا نام ''ٹیپو'' رکھنا۔ لہٰذا بچے کی پیدائش پر حیدر علی نے بیٹے کا نام فتح علی ٹیپو سلطان رکھا۔ (۲)

آپ کا شجرہ نسب: (۳)

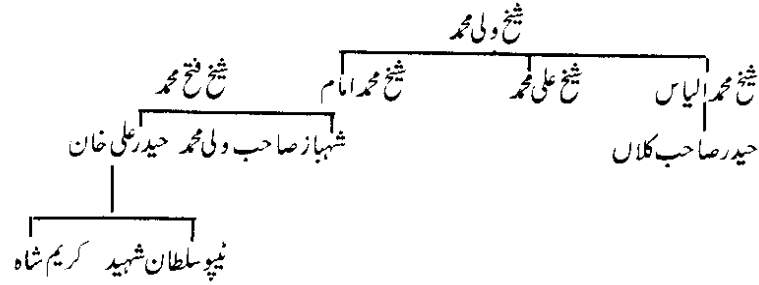

ٹیپو سلطان کے آباء واجداد تصوف کے میدان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے جد امجد شیخ ولی محمد دہلی سے ہجرت کر کے گل برگہ میں آ کر رہائش پذیر ہو گئے۔ آپ کے علم و اخلاق کی وجہ سے جلد ہی حضرت بندہ نواز کی درگاہ کے مجاوروں اور خادموں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور ان کے اخراجات کے لئے ماہانہ امداد مقرر کی۔ شیخ ولی ایک صوفی منش آدمی تھے لیکن آپ کے بیٹے شیخ فتح محمد نے خاندانی روایت توڑ کر نواب سعادت اللہ خان صوبہ دار کے ہاں فوج کی ملازمت کر لی۔ ۱۱۳۴ھ میں آپ کے ہاں حیدر علی خان کی پیدائش ہوئی۔

اپنے والد کی طرح حیدر علی خان نے بھی سپہ گری کو اختیار کیا اور سرینگ پٹن کے راجہ کے ہاں فوج کی ملازمت اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے فوج کے سپہ سالار بن گئے اور ۱۱۷۱ھ میں حیدر علی نے قلعہ میسور کی خود مختاری حاصل کر لی (۴)۔ خود مختاری حاصل کرنے کے بعد حیدر علی خان نے ریاست میسور کی تنظیم کی اور اس کی ترقی اور عظمت کے لئے کوشاں ہو گئے۔ نظام نے ۱۷۶۸ء میں آپ کو ''نصیب الدولہ'' اور ''فتح علی خان بہادر'' کے خطابات دیئے۔

ٹیپو سلطان کے ابتدائی حالات سے زیادہ آگاہی حاصل نہیں ہوتی' کیونکہ ان سے متعلق معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ٹیپو سلطان کی پرورش میں

اس کے والد نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

پانچویں سال میں تعلیم شروع ہوئی۔ اسلامی علوم کے علاوہ عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل کی۔ انگریزی اور فرانسیسی بھی سیکھ لی تھی۔ حیدر علی نے اپنے بیٹے کے لئے بچپن ہی سے مناسب تعلیم و تربیت کے انتظام کئے۔ مسلمانوں کے تمام علوم و فنون کی تعلیم و تربیت کی خاطر اچھے سے اچھے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بچپن کی حدود پھلانگ کر جب ٹیپو سلطان جوانی کے عہد میں قدم رکھنے لگا تو اس وقت حیدر علی نے اپنے بیٹے کو عملی فنون سکھانے پر بھی توجہ دی۔ چنانچہ اس نے نشانہ بازی' گھڑ سواری' شمشیر زنی' تیر افگنی' تفنگ اندازی' کشتی' تیراکی وغیرہ میں لاثانی مشق حاصل کر لی۔ قرآن مجید' اسلامی تعلیمات اور دوسرے اسلامی شعائر کی تعلیم ٹیپو سلطان کو اس سے بہت بیشتر ہی سکھا دی گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی جوانی ہی میں ٹیپو سلطان نے متعدد اسلامی اور تاریخی کتب کا مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان کی مطالعہ کی یہ عادت زندگی بھر قائم رہی۔ عین جوانی میں ٹیپو سلطان کی دو شادیاں اس کے ماں اور باپ کی پسند پر ہوئیں۔ (۵)

ٹیپو سلطان کی فوجی مصروفیت

پندرہ سال کی عمر میں ٹیپو سلطان کی فوجی مصروفیت شروع ہوئی۔ حیدر علی نے شروع سے ہی ٹیپو سلطان کو اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا۔ ۱۷۶۵ء کے حملہ مالابار میں ٹیپو سلطان نے اپنے والد کے ساتھ شرکت کی اور یہ جنگ کے عملی تجربہ کا پہلا موقع تھا۔

جنگ میسور میں حیدر علی خان نے ٹیپو سلطان کو غازی خان اور بعض دوسرے سالاروں کے ہمراہ مدراس کی جانب بھیج دیا تاکہ انگریز کی جنگی سرگرمیوں کے مرکز میں ہراس پیدا کیا جائے۔ شہزادے نے میسوری رسالے کے چھاپوں سے مدراس کے مضافات میں تہلکہ مچا دیا اور خود شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ عین اس وقت حیدر علی خان کی طرف سے تاکیدی بلاوا آ گیا اور سلطان کو لوٹنا پڑا۔

سلطان ٹیپو ترپاتور اور وانم باڑی کی تسخیر میں والد کے ساتھ رہا۔ انبور کے

محاصرے میں بھی شریک تھا۔ انگریزی فوج نے پیش قدمی کی تو محاصرہ چھوڑنا پڑا۔ کرنل سمتھ کے ساتھ لڑائی پیش آئی تو ٹیپو سلطان رسالے کے دائیں بازو پر متعین تھا۔ اس نے انگریزوں پر اس طرح حملہ کیا جیسے شیر ہرنوں پر کرتا ہے۔ سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اتارا' ان کی جمعیت درہم برہم کی' چند انگریز سرداروں کو پالکیوں اور گھوڑوں کے ساتھ گرفتار کیا اور مظفر و منصور والد کے پاس وانم باڑی پہنچے۔ (۶)

۱۷۸۲ء میں اپنے والد کی معیت میں ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے ایک مشہور کرنل بریتھ ویٹ (Breath Wate) کو بھی بڑی کھلم کھلا شکست دی تھی۔ کرنل بریتھ ویٹ کی اس شکست نے تو ٹیپو سلطان کی برطانیہ تک دھوم مچا دی تھی۔ بہرصورت حیدر علی کی وفات تک ٹیپو سلطان نے اپنے گردونواح کے ملکی دشمنوں اور استعماری طاقتوں کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا۔ وہ دوست و دشمن کو بھی بخوبی پہچاننے لگا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاست میسور میں ان فتوحات اور جوانی کے جوشیلے کارناموں کے باعث وہ عوام کی نظروں میں ایک اچھا جرنیل اور امراء میں ہر دلعزیز ہو چکا تھا۔

ٹیپو سلطان کی تخت نشینی

۷ دسمبر ۱۷۸۲ء کو چتوڑ کی لڑائی کے دوران ٹیپو سلطان کا والد حیدر علی اپنی بیماری اور کمزوریٔ صحت کے باعث اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ وفات سے پہلے حیدر علی نے ٹیپو سلطان کو ایک خط لکھوایا اور یہ تحریر کیا:

''ادھر کا بندوبست ٹھیک ٹھاک کر کے جلد یہاں آ جاؤ۔ دولت و ثروت کے تمام لوازم پر گہری نظر رکھنی چاہئے۔ اگر امداد کے لئے خرچ کی ضرورت ہو تو منگا لو۔ ہم نے تمہیں دولت کے تمام انتظامات کا مختار بنا دیا ہے۔ سرکاری کام میں تھوڑے سے وقت' بلکہ ایک لمحہ کا بھی تغافل نہ ہونا چاہئے''۔ (۷)

حیدر علی کی تجہیز و تکفین کے بعد فتح علی ٹیپو سلطان نے بغیر کسی روک ٹوک کے میسور میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر کے تخت شاہی سنبھال لیا۔ حیدر علی کی اولاد میں سے ٹیپو کا ایک چھوٹا بھائی بھی زندہ تھا۔ اس نے بھی تخت نشینی کو کوئی مسئلہ نہ بنایا۔

۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء کو تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ (۸)

ٹیپو سلطان جس سلطنت کا والی تھا وہ شمال میں دریائے کرشنا سے جنوب میں ریاست ٹراونکور اور ضلع تناولی تک پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق میں مشرقی گھاٹ اس کی حد تھی اور مغرب میں اس کا دامن سمندر کو چھو رہا تھا۔ یقیناً یہ بہت بڑی اور شاندار سلطنت تھی۔ پھر آبادی، زرخیزی اور حسن انتظام کے علاوہ قدرتی دولت کی فراوانی کے اعتبار سے بھی اس کا پایہ بہت بلند تھا۔ لیکن اس کے ساتھ رزم و پیکار کا بھی ایک لامتناہی سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ نظام اور مرہٹے اسے ہڑپ کر جانے کے درپے تھے۔ انگریز اسے ہندوستان پر اقتدارِ کامل میں سب سے بڑی بلکہ واحد رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اس کی گرانقدر ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کیلئے خاص عزم و حوصلہ کے فرمانروا کی ضرورت تھی جو تمام خطرات کا مقابلہ تنہا کر سکتا۔ ٹیپو سلطان شہزادگی کے زمانے میں ان جوہروں کے ثبوت پیش کر چکا تھا اور سترہ سال کی مدتِ حکومت میں بھی اس کے عزم و حوصلہ کو کوئی قوت شکست نہ دے سکی۔ یہاں تک کہ خونِ شہادت سے ان پر دائمی مہر لگ گئی۔

ٹیپو سلطان کے معرکے

ٹیپو سلطان کی ساری زندگی معرکوں میں گزری۔ ان میں اس نے انگریز، مرہٹوں اور نظام دکن سے معرکے کئے۔ ٹیپو سلطان نے بہت کوشش کی کہ انگریز کو برصغیر سے نکالنے کے لئے نظام دکن اور مرہٹوں سے معاہدہ ہو جائے، لیکن نظام دکن اور مرہٹے اس سے خائف رہتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید ٹیپو سلطان انگریزوں کو شکست دینے کے بعد اُن پر حملہ آور ہو گا۔ اس طرح ٹیپو سلطان برصغیر کے حکمرانوں سے مایوس ہو کر فرانسیسی، ترکی اور افغانی بادشاہوں سے مدد لینے پر مجبور ہوا۔ ٹیپو سلطان نے اس معرکہ میں جس میں اس کے والد شہید ہوئے تھے، انگریزوں کو شکست دی۔

اس کے بعد کبھی انگریز اکیلے اور کبھی نظام اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر سلطنت خداداد پر حملہ آور ہوتے رہے۔ اکثر کامیابی سلطان کو ہی حاصل ہوتی۔

دسمبر ۱۷۹۰ء میں لارڈ کارنواس (Lord Karnawas) مدراس پہنچا اور خود فوج کی کمان سنبھال کر تازہ دم فوج اور اپنے نئے توپخانہ سے حملہ کر دیا۔ یہ جنگ

سرنگاپٹم سے نو میل کے فاصلے پر ہوئی۔ سلطان کو شکست ہوئی اور وہ سرنگاپٹم میں محصور ہو کر رہ گیا۔ لیکن لارڈ کارنواس کو مکمل کامیابی نہ ہو سکی اور وہ محاصرہ نہ توڑ سکا۔ اس موقع پر نظام اور مرہٹے اپنی اپنی فوجیں لے کر انگریزوں کی مدد کو پہنچ گئے اور جملہ افواج نے باہم مل کر سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا اور جنوری ۱۷۹۲ء میں سلطان کو صلح کرنا پڑی۔ (۹)

شرائط صلح

تینوں اتحادیوں نے مشورہ و تجویز کے بعد اس شرط پر صلح کر لینے سے اتفاق ظاہر کیا کہ تین کروڑ روپیہ کے محاصل کا علاقہ اور اسی قدر روپیہ سلطان تینوں اتحادیوں کو دے گا' اور رقم کی ادائیگی تک قلعہ کا ایک دروازہ انگریزی فوج کی تحویل میں دے دے یا شہزادوں کو کفیل بنا کر انگریز سپہ سالار کے پاس روانہ کر دے۔ (۱۰) ان شرائط کے مطابق صلح ہوئی اور شہزادے انگریزوں نے اپنی کفالت میں رکھ لئے۔

آدھی مملکت دینے کے بعد سلطان نے ریاست میسور کی تنظیم نو کی اور ان تمام افراد کو تباہ و برباد کر دیا جنہوں نے اس سے غداری کی تھی۔

سلطان کی نئی اصلاحات

سلطان نے خانگی امور سے فراغت کے بعد ملک کے نظم و نسق کو درست کرنے کی طرف توجہ دی۔ عہدہ دارانِ حکومت اور عمال کے تبادلوں اور سزاؤں کا سلسلہ موقوف کر کے ان کو راہِ راست پر رکھنے کے لئے عہد و قرار لینے کی تجویز پر عمل درآمد شروع کیا اور اپنے عملہ اور اہلکاروں سے حلف لیا کہ ''ہم ہرگز سرکاری فرائض میں کوتاہی نہیں کریں گے اور محاصل کا روپیہ روانہ کرنے میں کسی قسم کا تصرف اور تغلب نہیں کریں گے' رعیت کی ایذا رسانی کے مرتکب نہیں ہوں گے' ہمیشہ نماز کی پابندی اور اوراد و وظائف کا التزام رکھیں گے اور معاصی و مناہی سے اجتناب برتیں گے۔ اس عہد کے بعد ہر شخص کو حسابات کے معافی نامے' تعلقوں کی بحالی کے پروانے' خلعتیں اور رخصتی کے پان عنایت کئے جاتے۔ (۱۱)

سلطان نے ملک میں فارسی زبان کو رائج کیا اور اسے سرکاری و دفتری زبان

بنایا۔ سلطان کے حکم سے ہر موضع میں مسجد تعمیر کروائی گئی اور حکومت کی جانب سے وہاں مؤذن' ملا اور قاضی مقرر کئے گئے۔ ان مسجدوں میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تدریس کا پورا پورا اہتمام کیا گیا۔ سلطان نے اس دور میں قلعہ پٹن کی دوبارہ تعمیر کروائی۔

ٹیپو سلطان کی شہادت

آخر کار لارڈ ولزلے (Lord Willsley) نے جنوبی ہندوستان کے متعدد حکمرانوں' مرہٹوں اور نظام کو رام کرنے کے بعد فروری ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا۔ اس تمام جنگ کی مجموعی نگرانی ولزلے نے اپنے ہاتھ میں رکھی اور افواج کی کمان جنرل ہیرسن (Gen.Harison) کے سپرد کر دی۔ اس جنگ میں ایک محاذ ولزلے کے بھائی آرتھر ولزلے (Aurther Willsley) کو بھی سونپ دیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد انگریزی فوجوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ کو روکنے اور دشمن کو شکست دینے کے لئے ٹیپو سلطان نے بڑی جرأت' دلیری اور حکمت عملی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ٹیپو سلطان تو اپنے ملک کے ایک ایک چپہ کے لئے لڑ رہا تھا مگر اس کی فوج کے کئی جرنیل غداری کر رہے تھے۔ ان غداریوں اور انگریزوں کے ہر جانب سے حملوں کے باعث ٹیپو سلطان نے میسور کے دارالحکومت سرنگاپٹم میں محصور ہو کر پناہ لے لی تھی۔

یہ محاصرہ کئی روز تک جاری رہا۔ ۱۷/اپریل ۱۷۹۹ء کو اس محاصرے کے دوران انگریزوں نے قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے۔ اس کے باوجود سلطان کی افواج بہادری کے ساتھ جنگ کرتی رہیں۔ پھر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو انگریز افواج کے کئی دستے قلعے کے اندر داخل ہو گئے اور ٹیپو سلطان کو گھیر لیا۔ کرمانی کا بیان ہے کہ سلطان تنگ جگہ میں لڑتے رہے۔ دو تین آدمیوں کو گولی اور تلوار سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر ایک انگریز کی گولی انہیں کان کے پاس لگی جس کی بنا پر وہ شہید ہو گئے۔ اس سانحہ ہوش ربا کی تاریخ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

ٹیپو سلطان شہید شد ناگاہ خودِ خود ریخت فی سبیل اللہ

بود ذی قعدہ بیست و ہشتم آن شدہ در روز شنبہ حشر عیاں
ہفت ساعت ز صبح بگزشتہ خون ز دیوار و در رواں گشتہ
زیست پنجاہ سال با اقبال بادشاہی نمود ہفت دہ سال
داشت در دل ہمیشہ عزم جہاد گشت آخر شہید حسب مراد
آہ تاراجی مکین و مکان خون بگریند اے زمین و زمان
چو غم او بحرز کل دیدم سال ماتم ز درد پرسیدم
گفت ہاتف زنیم آہ بہ تفت نور اسلام و دین ز دنیا رفت

ایک سادہ تاریخ یوں بھی بیان کی گئی۔ ''نسل حیدر شہید اکبر شد''(۱۲)

تجہیز و تکفین

انگریزوں نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد شہید کے لاشہ کو مقتل سے اٹھوایا۔ صبح ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ بمطابق ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو تمام لڑکوں اور خدمت گاروں کو ان کا آخری دیدار کرایا۔ اور جب یقین ہو گیا کہ سلطان کی لاش یہی ہے تو دفن کر دینے کی اجازت دی۔ اعزہ نے لعل باغ کے شاہی مرقد میں نواب مرحوم کے دائیں جانب اس شہید با تمکین کو ہمیشہ ہمیش کے لئے سپردِ خاک کر دیا۔ کسی نے کیا خوب کہا:

رفت سلطان زیں سرائے ہفت روز نوبت او در دکن باقی ہنوز

حواشی

۱) نشان حیدری، سید میر حسین کرمانی، مترجم محمود احمد فاروقی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، س۔ن۔ ص ۳۸، ۳۹
۲) اکابرین تحریک پاکستان، محمد علی چراغ، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۷ء، ص ۶۹
۳) نشان حیدری، ص ۲۳
۴) نشان حیدری، ص ۴۷
۵) اکابرین تحریک پاکستان، ص ۷۰
۶) نشان حیدری، ص ۱۳۲، ۱۳۳
۷) نشان حیدری، ص ۲۴۸
۸) نشان حیدری، ص ۲۵۹
۹) برصغیر میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا آئینہ، محمد اسماعیل ذبیح، علوی پبلشرز کراچی ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۹
۱۰) نشان حیدری، ص ۳۶۳
۱۱) نشان حیدری، ص ۳۶۸
۱۲) نشان حیدری، ص ۳۹۰

تعارفِ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

کتاب = کاروانِ حدیث
مصنف = عبدالرشید عراقی
صفحات = 360
قیمت = 144 روپے
ناشر = نوراسلام اکیڈمی' پوسٹ بکس 5166' ماڈل ٹاؤن لاہور

محدثین کرام وہ قابل قدر ہستیاں ہیں جن کا احسان امت مسلمہ کے افراد کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے طویل سفر کر کے اور طرح طرح کی صعوبتیں اور مشکلات برداشت کر کے نبی آخر الزماں ﷺ کے فرمودات یکجا کئے' پھر ان کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق ترتیب دے کر کتابوں کی صورت میں مرتب کیا اور بعد میں آنے والوں کے لئے آسانی پیدا کی۔ عبدالرشید عراقی صاحب نے ان قدسی صفات افراد میں سے بیالیس شخصیات کے مختصر حالات زندگی کاروان حدیث میں یکجا کر دیئے ہیں۔ محدثین کرام کے اس تذکرے میں تحصیل احادیث کے ضمن میں ان کی کاوشوں کے علاوہ ان کی تصنیفات کا بھی مختصر ذکر ملتا ہے۔ اس طرح یہ کتاب تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ایک مفید دستاویز اور Reference Book بھی ہے۔

فاضل مصنف معتدل' متوازن اور صحت مند فکر و نظر کے مالک ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انہوں نے انتہائی ذمہ داری کے ساتھ خوفِ خدا کا جذبہ پیش نظر رکھتے ہوئے دین کی خدمت سمجھ کر کیا ہے۔ صحاح ستہ کے مرتبین کے علاوہ چھتیس دوسرے محدثین کے حالات زندگی مستند حوالہ جات کے ساتھ قلمبند کرنا آسان کام نہیں ہے۔

محدثین عظام کے اس تذکرے کے آغاز میں مصنف نے مقدمہ لکھا ہے جس میں حجیت حدیث' تدوین حدیث اور کتابت حدیث کے عنوانات کے تحت مستند معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر حکیم راحت نسیم سوہدروی کی تقریظ ہے' جس میں انہوں

نے اہمیت حدیث کے سلسلہ میں جامع اور مفید باتیں لکھ کر مصنف کی اس کوشش کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی بہت خوبصورت ہے۔ پروف ریڈنگ بڑی احتیاط سے کی گئی ہے۔ پوری کتاب کے مطالعہ کے دوران کتابت کی کوئی غلطی نظر سے نہیں گزری اس طرح ''کاروان حدیث'' معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ حسن ظاہری سے بھی مزین ہے۔ یہ کتاب طلبائے علوم اسلامیہ کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔

☆☆☆

نام کتاب = زیارت القبور اور الوسیلہ کا مفہوم

مولف = اشفاق الرحمٰن خان

ملنے کا پتہ = 2-51 ڈی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور

اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ہمیں راہنمائی نہ ملتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض مسلمانوں کا کردار اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اسلامی تعلیمات میں انسان کے سفر آخرت کی تیاری سے لے کر میت کو سپرد خاک کرنے تک کے تمام مراحل کے لئے راہنمائی موجود ہے۔ علمی انداز میں تو باتیں سب کو معلوم ہیں لیکن عملی کوتاہی بہت عام ہے۔ فاضل مصنف نے اسی چیز کو محسوس کرتے ہوئے زیارت القبور کے سلسلہ میں ہونے والی بدعات کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ قبروں کی زیارت کے بارے میں نہ صرف آنحضرت ﷺ کی ہدایات کتب حدیث میں موجود ہیں بلکہ خود آپ کا اسوۂ حسنہ بھی واضح ہے۔ چنانچہ اس چھوٹے سے کتابچے میں مستند کتب احادیث میں سے ثقہ اور پختہ روایات کی روشنی میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ قبروں کو پختہ بنانا اور ان پر کتبے لکھنا' یہاں تک کہ چراغ جلانا ہی سختی سے منع کیا گیا ہے' چہ جائیکہ قبروں پر عمارتیں اور قبے بنا کر ان کو مزین کیا جائے اور پھر وہاں عرس اور میلے منعقد کئے جائیں۔ مصنف نے زیارت قبور کا صحیح اور مسنون طریقہ بتا کر امر بالمعروف اور قبروں پر ہونے والی بدعات کی نشاندہی کر کے نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا ہے۔

اسی طرح اس کتابچے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے کسی کو وسیلہ بنانے کے موضوع پر بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح طرز عمل واضح کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا موقف یہ ہے کہ دعاؤں کے بہترین الفاظ وہ ہیں جو خود قرآن حکیم میں بتائے گئے ہیں یا پھر وہ

مسنون دعائیں ہیں جو اسوۂ حسنہ سے ثابت ہیں۔ فاضل مصنف کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ قرآن و حدیث میں منقول دعاؤں میں بحق فلاں وغیرہ کے الفاظ نہیں ملتے۔ البتہ کسی نیک آدمی کی زندگی میں اس کے پاس جانا اور اس سے اللہ کے حضور دعا کے لئے کہنا عین درست ہے۔

الغرض مصنف نے بہت محنت سے متعلقہ عنوان کی آیات اور احادیث کو اس کتابچے میں اکٹھا کر دیا ہے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص تعصب کو بالائے طاق رکھ کر اس کتابچے کا مطالعہ کرے گا اسے زیارت القبور اور الوسیلہ کے سلسلہ میں صحیح راہنمائی مل جائے گی۔

اس اہم عنوان پر تیار کئے جانے والے اس کتابچے کی پروف ریڈنگ پوری احتیاط سے نہیں ہو سکی۔ اگلی اشاعت میں اغلاط کی اصلاح ہو جانی چاہئے۔

☆☆☆

نام کتاب = معراج المؤمنین (کتاب الصلوٰۃ)

مؤلف = اشفاق الرحمٰن خان

ملنے کا پتہ = 51-2 ڈی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور

نماز پنجگانہ کی اہمیت مسلم ہے۔ ہر مؤمن پر اقامت صلوٰۃ پابندیٔ اوقات کے ساتھ لازم ہے۔ پھر نماز کی ادائیگی کا انداز بھی وہی ہونا چاہئے جو مسنون ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو''۔ فاضل مصنف نے یہ کتاب اسی نقطہ نظر سے لکھی ہے کہ ہر مسلمان نماز کی ادائیگی مسنون طریقے سے کر کے بھرپور ثواب حاصل کر سکے۔

چونکہ نماز سے قبل طہارت ضروری ہے لہٰذا اسوۂ حسنہ کی روشنی میں طہارت حاصل کرنے یعنی وضو اور غسل کا طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے۔ پھر نماز کے تمام ارکان کی ادائیگی کا مسنون طریقہ بتاتے ہوئے متعلقہ احادیث بھی لکھ دی گئی ہیں' تاکہ قاری ان احادیث کو خود پڑھ کر مطمئن ہو سکے۔ کتاب میں کوئی غیر مستند بات دیکھنے میں نہیں آئی۔

مصنف نے بہت عرق ریزی سے کام لے کر نماز سے متعلق تمام باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے متعلقہ احادیث بھی متن اور ترجمے کے ساتھ درج کر دی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں پنجگانہ نماز کے علاوہ دیگر مسنون نمازوں مثلاً نماز تہجد' نماز تراویح' نماز جمعہ' نماز عیدین' نماز خوف' مسافر کی نماز' مریض کی نماز' صلوٰۃ الحاجت' صلوٰۃ التسبیح' نماز استخارہ کی ادائیگی کے متعلق بھی مستند معلومات دے دی گئی ہیں۔

الغرض جو شخص سنت کے مطابق نماز کی ادائیگی کی خواہش رکھتا ہو اس کے لئے یہ کتاب مکمل راہنمائی کے لئے کافی ہے۔ مسلمان عورتوں اور مردوں کے لئے یہ کتاب پڑھنے اور استفادہ کے لئے پاس رکھنا مفید ہے۔ کتاب کے کل ۱۷۷ صفحات ہیں۔ اتنی مختصر کتاب میں اتنی زیادہ معلومات جمع کرنا مصنف کی کاوش اور جذبہ نصیحت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

☆☆☆

نام کتاب = ماہنامہ ''البرہان'' کراچی
شمارہ = دسمبر ۲۰۰۰ء
قیمت = ۲۰ روپے
پتہ = سعودیہ محل' اقبال سنٹر' ناظم آباد نمبر ۳' کراچی ۱۸

ماہنامہ ''البرہان'' کا پہلا شمارہ سادہ مگر خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے مضامین مسلم امہ کے لئے گہری افادیت کا پہلو رکھتے ہیں۔ مضامین کا انداز تحقیقی اور مواد مستند ہے۔ اکثر مضمون نگار عالمی شہرت کے محقق اور عالم دین ہیں۔ چونکہ عالم اسلام اس وقت انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے' کفر کی طاقتیں پوری قوت کے ساتھ امت مسلمہ پر یلغار کئے ہوئے ہیں اور خود مسلمانوں کی اکثریت مغربی چمک دمک سے متاثر ہو کر اسلامی تہذیب سے بیگانہ ہو رہی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ معیاری جرائد غلبہ عالم اسلامی کے لئے انقلابی انداز میں جدوجہد میں شامل ہوں اور اُمت مسلمہ کی بیداری کے لئے بھرپور کردار ادا کریں۔

رسالے کی کمپوزنگ اور ایڈیٹنگ اگرچہ خاصی معیاری ہے تاہم کہیں کہیں سقم موجود ہے۔ آیات قرآنی لکھنے میں بھی کہیں کہیں سہو ہوا ہے' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروف ریڈنگ پوری احتیاط سے نہیں کی گئی۔

☆☆☆

''عقل'' اور ''عشق'' کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنا
علم وحکمتِ قرآنی ہی کے ذریعے ہی ممکن ہے

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام جناب باسط بلال کوشل کے تین لیکچرز (بزبان انگریزی) پر مبنی محاضرات قرآنی کی ایک اجمالی رپورٹ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے تک قرآن کا پیغام پہنچانے کے لئے اس سال ۱۱ تا ۱۳ مارچ قرآن آڈیٹوریم لاہور میں محاضرات قرآنی کا اہتمام کیا۔ اس سیمینار کے مقرر امریکہ سے آئے ہوئے سکالر باسط بلال کوشل تھے۔ باسط بلال کوشل امیر تنظیم اسلامی وصدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے شاگرد رشید ہیں اور آج کل امریکہ کی دو یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ باسط بلال کوشل کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے ۱۹۶۷ء میں کی جانے والے تشخیص کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے حکمت قرآنی کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے تاکہ آج کے تعلیم یافتہ افراد کو مغربی تہذیب کے زیر اثر پیش آمدہ مسائل کا قرآنی حل بتا کر انہیں ایمان کی دولت سے مالا مال کیا جا سکے۔ اگرچہ امریکہ میں انہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں تن تنہا یہ کام شروع کیا تھا مگر اب ''گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں'' کے مصداق انہوں نے امریکہ میں ایسے نوجوانوں کا حلقہ تیار کر لیا ہے جو دین کی اس خدمت میں ان کے ساتھ دن رات مصروف ہیں۔ ان حضرات میں عرفان اقبال، ڈاکٹر احمد افضال اور ماہان مرزا نمایاں ہیں۔

پہلے دن کا لیکچر

پہلے دن قاری مقبول احمد صاحب نے تلاوت کلام پاک سے اس سیمینار کا آغاز کیا۔

پروگرام کا آغاز شام ۶:۴۵ پر ہوا۔ ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر اسرار احمد تھے جبکہ پہلے لیکچر کی صدارت ڈاکٹر سہیل عمر ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی نے کی۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض ڈاکٹر ابصار احمد نے سرانجام دیئے۔ ان لیکچرز کا جامع عنوان ''اقبال، اسلام اور اکیسویں صدی'' تھا۔ تاہم مقرر باسط بلال کوشل نے اپنے لیکچرز کو تین عنوانات میں تقسیم کیا تھا۔ پہلے دن کے لیکچر کا عنوان تھا:

The Ayaat of Allah :The Concrete Material as a Gateway to the Ineffable Spiritual

انہوں نے کہا کہ اقبال نے ہماری توجہ ماڈرن آدمی کے اندر ہونے والے ایک تصادم کی طرف کرائی ہے۔ یعنی ایک طرف عقل ہے اور دوسری طرف عشق۔ ان میں ایک تصادم ہے۔ چونکہ ماڈرن آدمی کا زور عقل، اس دنیا اور کائنات کے مادی حقائق پر ہے لہٰذا وہ عشق کے تجربات کی نفی کرتا ہے۔ چونکہ اللہ کے وجود کا کوئی فلسفیانہ ثبوت نہیں ہے لہٰذا عقل اور عشق کے درمیان ایک بہت بڑا فاصلہ ہے۔ اس فاصلہ کو ختم کرنے کے لئے قرآنی حکمت اور علم کے ذریعے عقل اور عشق کے درمیان پل بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن خود عقل کے ذریعے مذہبی حقائق کو پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

علامہ اقبال صرف شاعر، ماہر تعلیم اور فلسفی ہی نہیں تھے، بلکہ اقبال کا کام فرد کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلانا تھا جو درحقیقت اسلام کا اصل مقصد ہے۔ انہوں نے اقبال کی نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' کے اشعار کی روشنی میں وجود باری تعالیٰ، نبوت کی ضرورت اور ایمان بالآخرۃ کے لئے نفس انسانی، تاریخ اور فطرت سے دلائل پیش کئے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن نہ صرف خود انسان کو ہدایت دیتا ہے بلکہ کائنات میں پھیلے ہوئے لاتعداد حقائق پر غور و فکر کے ذریعے ہدایت حاصل کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھوس مادی حقائق بھی ہمیں غیب کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ لہٰذا انسان اگر غور کرے تو اسے اپنے اندر، اور اردگرد پھیلے ہوئے حقائق سے تمام سوالوں کا جواب مل سکتا ہے، جن کے حصول میں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہی مشن تھا کہ آج کے انسان کو قرآن کے ذریعے ان سوالوں کا جواب دیا جائے۔

سہیل عمر صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ کائنات میں ہر شے اللہ کی نشانی

ہے۔ہم کسی پینٹنگ کو دیکھتے ہیں تو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پینٹر نے کیا کہا ہے۔سب کی رائے مختلف ہوسکتی ہے لیکن وہ اس بات پر متفق ہوتے ہیں کہ بنانے والے نے کچھ پیغام دینا چاہا ہے۔اقبال کا مشن یہ تھا کہ مخالفین اسلام کو اپنا موقف اس مقام سے سمجھایا جائے جہاں وہ کھڑے ہیں۔باسط بلال مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اقبال کے اس پوائنٹ کو سمجھا ہے۔باسط بلال کا یہ کہنا کہ اقبال کی شاعری اور نثر میں کوئی تضاد نہیں' میں اس سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔

دوسرے دن کا لیکچر

دوسرے دن کے پروگرام کا آغاز شام ۶:۴۵ پر قاری مقبول احمد صاحب نے تلاوت قرآن پاک سے کیا۔مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر اسرار احمد تھے' جبکہ تقریب کی صدارت فرزند اقبال جناب جسٹس (ر) جاوید اقبال نے کی۔سٹیج سیکرٹری جناب ڈاکٹر ابصار احمد نے ابتدائی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ کیا خوبصورت اتفاق ہے کہ یہ لیکچر سیریز علامہ اقبال کے فکر سے متعلق ہے اور سٹیج پر علامہ کے فرزند معنوی محترم ڈاکٹر اسرار احمد اور حقیقی فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال بیٹھے ہیں' جبکہ میں فلسفۂ اقبال کا استاد ہوں۔

مقرر باسط بلال کوشل کے لیکچر کا عنوان تھا:

From the Modern Crisis of Religion to the Post-modern Crisis of Secularism.

انہوں نے کہا کہ جاگیردارانہ نظام کو مذہبی منظوری حاصل ہے اور وہ انسان پر جبر کر رہے ہیں۔موجودہ معاشی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے موت کا کھیل عام کیا جا رہا ہے۔ماضی میں عبادت گاہیں خوبصورت ترین عمارتیں ہوا کرتی تھیں آج بنکوں کی عمارتیں اعلیٰ ترین ہیں جو سود کا گڑھ ہیں۔سود سے ایک کو فائدہ ہوتا ہے لیکن لاکھوں کی زندگی کا سودا کر کے انہیں موت کے گڑھے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں سودی قرضوں کی وجہ سے ۱۸ ہزار لوگ روزانہ مرتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ افغانستان پر عائد شدہ پابندیاں خود اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی ہے۔سپورٹس کے ذریعے لوگوں کو بیکاری کا عادی بنایا جا رہا ہے۔ایک ماہر سوشیالوجی کہتا ہے کہ آج کے انسان کے سیکولر نظریات ہل چکے ہیں' فزکس کے نظریات ہل چکے ہیں۔

جارج سوروا اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ یہ عالمی معاشی نظام کسی دن دھڑام سے گر پڑے گا۔ ان حقائق کی وجہ سے آج کے انسان کا سیکولرازم پر ایمان متزلزل ہو گیا ہے۔ انبیاء کی زندگی کا مقصد اس دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنا تھا لہٰذا صرف اسلام ہی ہمیں کامل عدل و انصاف دے سکتا ہے۔

جناب جاوید اقبال نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا: میں نے اس لیکچر سے یہ سمجھا ہے کہ جو مسلمانوں کا ماڈرن دور تھا وہ یورپ کا ''ڈارک ایجز'' تھا اور جس زمانے میں یورپ جدیدیت کی طرف گیا ہماری تہذیب مضمحل ہو گئی۔ علامہ اقبال نے ہمیں خود پر تنقید کرنا سکھایا تا کہ ہم ترقی کر سکیں۔ آج اگر ہم خود پر تنقید کرتے تو ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ اللہ نے ہمیں ذمہ داری دی تھی کہ دنیا کو ایک عادلانہ نظام دیں تا کہ لوگوں کو اس دنیا میں مسرت اور آخرت کی آسودگی حاصل ہو۔ دوسرے معاشروں میں مسرت کا تصور صرف اسی دنیا تک محدود ہے جبکہ ہمارے ہاں two-fold happiness کا تصور ہے۔ ہمیں دوسروں پر یہی برتری حاصل تھی لیکن ہمارا حال یہ کیوں ہوا کہ آج ہم دوسروں کے دست نگر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے دروں بینی سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم اپنی کوتاہیوں پر نگاہ رکھیں گے تو آگے بڑھیں گے۔

تیسرے دن کا لیکچر

پروگرام کا آغاز شام ۶:۵۰ پر ہوا۔ تلاوت کی سعادت قاری مقبول احمد صاحب نے حاصل کی۔ پروگرام کی صدارت امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کی۔ باسط بلال کوشل کے آج کے لیکچر کا عنوان تھا:

From Lailat-ul-Qadar to Yaum-ul-Furqan: A Contemporary Reading.

انہوں نے کہا کہ لیلۃ القدر اور یوم بدر میں یہ فرق ہے کہ لیلۃ القدر سے وحی کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ اس دن مکمل قرآن لوح محفوظ سے سماء دنیاوی پر نازل ہو گیا پھر وہاں سے ۲۳ سال میں آہستہ آہستہ اترا۔ یوم بدر کو یوم الفرقان کہا جاتا ہے۔ یوم بدر دراصل حضور ﷺ کے انقلابی عمل کے اختتام کے آغاز کا پہلا دن ہے۔ حضورؐ کے بعد اب کوئی وحی نہیں آئے گی لیکن استحصالی اور جابرانہ طبقات اب بھی موجود ہیں۔ آج ان کے استیصال کون کرے گا؟ حضور ﷺ کا واحد معجزہ قرآن تھا۔ آج کے ماڈرن شخص کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے

جبکہ ماضی کا مشرک کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتا تھا۔ آج کا ماڈرن آدمی فرائیڈ' نطشے اور مارکس کے مذہب کا پیروکار ہے جو صرف زن' زر اور زمین کی نمائندگی کرتے تھے۔ کوئی آسمانی کتاب چونکہ ان چیزوں کو ایڈریس نہیں کرتی لہذا آج کے آدمی کو مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا ہم زن (جنسیات)' زر (معیشت)' زمین (اقتدار) کا روحانیات سے تعلق جوڑ سکتے ہیں۔ جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کا جواب ہاں میں ملتا ہے۔ مثلاً قرآن کی طویل ترین ''آیتِ دین'' معاشی مسائل سے متعلق ہے۔ آیۃ الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات کے درمیان معاشی مسائل پر بحث کی گئی ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ معاشیات کا روحانیات سے تعلق ہے۔ اب ازدواجی تعلقات کی طرف آیئے۔ سورۃ النور کی دوسری آیت سے آگے چلیں تو اس کا بنیادی موضوع سماجی تعلقات ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کو روحانی ترقی کا باعث بتایا گیا ہے۔ طلاق کے وقت جب کہ تعلق ٹوٹ رہا ہوتا ہے فرمایا جا رہا ہے کہ تم کہ ان عورتوں سے بہتر سلوک کرو۔

اب آیئے اقتدار یعنی زمین پر غلبہ کی طرف' قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ قتال میں عبد اور معبود کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ میدان جنگ میں وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جو نوافل کی کثرت سے حاصل ہوتی ہے' یعنی انسان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

لہٰذا قتال روحانی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آج کے ماڈرن آدمی اور کفار کے تمام سوالوں کا جواب اس زندہ معجزے یعنی ''قرآن'' میں موجود ہے۔ اس قرآن کے ہوتے ہوئے آج اگر ہم ناکام ہو گئے تو یہ کائنات کی سب سے بڑی ناکامی ہو گی۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا صدارتی خطاب

آپ نے ان تین دنوں میں جو کچھ سنا وہ میری تحریک قرآنی کی اقصائے مغرب یعنی امریکہ سے آنے والی ایک بازگشت ہے۔ میری فکر کے چار گوشے ہیں:

۱) قرآن حکیم کے حوالے سے دین کی حقیقت کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے' یہ پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ غالب ہونا چاہتا ہے۔

۲) دوسرا گوشہ یہ ہے کہ یہ دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟ یعنی یہ کہ ہمارے فرائض نماز، روزہ ہی نہیں بلکہ اسے قائم کرنا اور شہادت علی الناس بھی ہماری ذمہ داریاں ہیں۔ پھر ان کے لوازم کہ دل میں ایمان، ظاہر میں جہاد ہو اور اس کے لئے بیعت سمع و طاعت والی جماعت جس کا طریقہ حضور ﷺ کی سیرت سے ماخوذ ہو۔ ۱۹۶۵ء میں میں نے یہ تحریک شروع کی۔ اس وقت سے میری تمام توانائیاں اس کام میں لگی ہیں۔ اس کے ساتھ میری فکر کے دو گوشے اور ہیں، وہ یہ کہ:

۳) عالمی ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی عذابِ خداوندی کی گرفت میں ہے اور اس مقام پر ہے جہاں یہودی تھے یعنی ذلت اور مسکنت اس پر تھوپ دی گئی ہے۔ اس عذاب میں تخفیف کا کوئی امکان نظر نہیں تا آنکہ کسی ایک ملک میں دین کو نافذ نہ کر دیا جائے۔ اس سزا کے سب سے بڑے حقدار عرب ہیں اس کے بعد ہم پاکستانی قوم اس کے مستحق ہیں۔

۴) میری فکر کا چوتھا گوشہ یہ ہے کہ قیامت سے پہلے یہ دین کل روئے ارضی پر غالب ہوگا اور اس کام کا آغاز اس خطے یعنی پاکستان اور افغانستان سے ہوگا۔

احادیث میں اس بارے میں پیشینگوئیاں موجود ہیں۔ چار سو سالہ تاریخ کا بہاؤ بھی ادھر ہی ہے۔ میں نے غلبۂ دین کے لئے دو میدان معین کئے ہیں، ایک یہ کہ گلوبل سطح پر جس تہذیب اور نظریات کا غلبہ ہے اس میں دراڑ ڈالی جائے کیونکہ جب تک یہ نہیں ہوگا کوئی دینی کام پنپ نہیں سکتا۔ دوسرے یہ کہ ایسی زبردست عوامی تحریک چلے جو باطل نظام کے محافظ لوگوں کو بہالے جائے۔ یہ تحریک کسی مضبوط جماعت کے بغیر نہیں چل سکتی جس کے کارکنوں نے خود پر دین نافذ کیا ہو۔ میں نے ۱۹۶۷ء میں ان دو کاموں کا تصور پیش کیا۔

پھر سات سال بعد انجمن خدام القرآن بن گئی لیکن کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا اور وہ مقصد ہمیں یہاں حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ تنظیم بنانے کے کام میں کسی حد تک کامیابی ہوئی لیکن اس کی بھی پراگریس کم ہے۔ میرا پہلا پراجیکٹ الحمدللہ امریکہ میں ثمر بار ہوا اور باسط بلال نے وہاں ایک گروپ بنالیا ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ پاکستان ہی وہ جگہ ہے جہاں سے دین کے غلبہ کا آغاز ہوگا۔ لہٰذا باسط بلال کی محنت اور کوشش کے نتائج ان شاء اللہ بہت جلد پاکستان میں بھی ظاہر ہوں گے۔ (رپورٹ: فرقان دانش خان)

1924ء میں خلافت کی تنسیخ

کے بعد عالم اسلام میں جو مساعی کسی عالمی اسلامی ادارے کی تاسیس
کے ضمن میں ہوئیں ان کے بارے میں ایک نہایت وقیع تحقیقی مقالہ

جناب عمران این حسین

آف ٹرینیڈاڈ (ویسٹ انڈیز) نے ڈاکٹریٹ کے تھیسز کے طور پر بزبان
انگریزی تحریر فرمایا جو دو حصوں پر مشتمل تھا:

1- FROM ISTAMBUL TO RABAT

2- FROM RABAT TO LAHORE

اس مقالے کے حصہ اول کا ترجمہ (کسی قدر تلخیص کے ساتھ) چند سال قبل
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے

استنبول سے رباط تک

کے عنوان سے شائع کیا تھا جس کا پہلا ایڈیشن بہت عرصہ قبل ختم ہو گیا تھا

اس کا نیا ایڈیشن شائع کر دیا گیا ہے

☆ کتابی سائز ☆ صفحات: 104 ☆ ہارڈ کور

قیمت : 35 روپے

(نوٹ: ان شاء اللہ اس تحقیقی مقالے کا دوسرا حصہ بھی ''رباط سے
لاہور تک'' کے عنوان سے جلد ہی شائع کر دیا جائے)